فہرست

شذرات	۱۴ اگست کا خواب	منظور الحسن	۲
	نو گیارہ سے سات سات تک	ریحان احمد یوسفی	۷
قرآنیات	آل عمران (۳: ۱۰۰-۱۰۹)	جاوید احمد غامدی	۱۱
معارف نبوی	قریش کی حکمرانی کے بارے میں روایت	معز امجد	۱۷
	کلمۂ توحید اور جنت	طالب محسن	۲۰
	جمعہ کا وقت	ساجد حمید	۲۴
دین و دانش	اخلاقیات (۸)	جاوید احمد غامدی	۲۷
نقطۂ نظر	چہرے کا پردہ	پروفیسر خورشید عالم	۳۱
حالات و وقائع	دہشت گردی اور مسلمان	خورشید ندیم	۵۹
	''قاسم بن محمد'' ـــــ ایک تنقید کا جائزہ	محمد وسیم اختر مفتی	۶۳

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

منظور الحسن

۱۴ اگست کا خواب

۱۴ اگست ۱۹۴۷ کو ہم نے سوچا تھا کہ ہم کرۂ ارض پر ایک ایسی سلطنت قائم کر رہے ہیں جہاں اسلام اپنے پورے فلسفے اور قانون کے ساتھ نافذ العمل ہو گا۔ چشم عالم ایک مرتبہ پھر اس عدل اجتماعی کا نظارہ کرے گی جو چودہ صدیاں پہلے خلافت راشدہ کی صورت میں ظہور پزیر ہوا تھا۔ اس کا وجود ملت اسلامیہ کے لیے مرکزی ادارے کا کردار ادا کرے گا اور غیر مسلم دنیا کے لیے اسلام کی مشہود دعوت قرار پائے گا۔ اس کے حدود میں مسلمانوں کی ترقی کی راہیں کسی دوسری قوم کے تعصب سے مسدود نہیں ہوں گی۔ وہ باہم متحد ہو کر اسے اسلام کا ایک مضبوط قلعہ بنا دیں گے اور دیگر مسلمانان عالم کے لیے سہارے اور تعاون کا باعث ہوں گے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہم ایک ایسی ریاست تشکیل دے رہے ہیں جو دور جدید میں فلاحی ریاست کے تمام تر تصورات کی آئینہ دار ہو گی۔ جہاں تفریق و امتیاز کے بغیر شہریوں کو ان کے حقوق میسر ہوں گے اور لوگ یکساں طور پر تعلیم، روزگار، صحت اور امن عامہ کی سہولتوں سے بہرہ مند ہوں گے۔ ہمارا تصور تھا کہ ہم ایک ایسا ملک معرض وجود میں لا رہے ہیں جس کا نظم سیاسی جمہوری اقدار پر مبنی ہو گا۔ اس کے عوام اپنا اجتماعی نظام خود تشکیل دیں گے اور انھیں اس میں تبدیلی کرنے اور اپنے حکمرانوں کے تقرر و تنزل کا پورا اختیار حاصل ہو گا۔

آج پاکستان کو قائم ہوئے نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ بیت چکا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس کا وجود سلامت ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ ہمارے خواب آج بھی تشنۂ تعبیر ہیں۔ اسلام کا عدل اجتماعی اور خلافت راشدہ تو افلاک کی باتیں ہیں، ہم ان ارضی اخلاقیات تک بھی رسائی حاصل نہیں کر سکے جو دنیا میں متفق علیہ ہیں اور جن پر اسلام سے

نا بلد اقوام بھی صدیوں سے عمل پیرا ہیں۔ یہ سلطنت اسلام کی تجربہ گاہ اور پھر اس کا مشہود نمونہ تو کیا بنتی، اسلام کی حیثیت عرفی کو مجروح کرنے کا باعث ضرور ہوئی ہے۔اس کے مکینوں نے اپنے قول وعمل سے اسلام کا جو تعارف پیش کیا ہے، اس کی روشنی میں اہل دنیا اسے ایک متشدد، غیر عقلی، جذباتی اور عصر حاضر سے غیر ہم آہنگ مذہب تصور کرتے ہیں۔فلاحی ریاست کے تمام تصورات بکھر چکے ہیں۔غربت اپنی انتہا کو چھو رہی ہے۔ملکی معیشت دن بہ دن رو بہ زوال ہے۔بیش تر آبادی کے لیے دو وقت کے کھانے کا حصول مشکل ہوتا جا رہا ہے۔تعلیمی پس ماندگی کا یہ عالم ہے کہ تعلیم کا اصل مقصد ملازمت کا حصول بن گیا ہے۔ درس گاہوں کی حالت یہ ہے کہ فلسفہ، ادب، تاریخ، عمرانیات، اقتصادیات، ریاضی، سائنس، آرٹ اور دیگر علوم وفنون کے وہ نصابات جن سے دنیا کی ترقی یافتہ اقوام کئی عشرے پہلے گزر کر انھیں متروک قرار دے چکی ہیں، وہ ان میں کسب فیض کا ذریعہ ہیں۔لوگوں کی اکثریت کو صحت کی ابتدائی ضرورتیں بھی میسر نہیں ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ فلاحی ریاست کے حوالے سے ہمارا سفر آج بھی اتنا ہی باقی ہے جتنا آج سے پچاس سال پہلے تھا۔ جہاں تک جمہوریت کا تعلق ہے تو حقیقت یہ ہے کہ ہم شاید چند دنوں کے لیے بھی اس کا تجربہ نہیں کر سکے۔ نیچے سے لے کر اوپر تک ہماری جمہوری سیاست محض مفادات کی سیاست واقع ہوئی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

یہ حال ہے جو ہمارے خوابوں اور ہمارے تصورات کا ہوا ہے۔ ہمارے اجتماعی وجود کی یہ حالت اس قدر نمایاں ہے کہ کوئی بھی اس کا انکار نہیں کر سکتا۔البتہ، یہ سوال ہر شخص کے ذہن میں ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اس صورت حال کا سبب کیا ہے؟ کیا یہاں افرادی وسائل کی کمی ہے، کیا یہاں بے صلاحیت لوگ بستے ہیں، کیا یہاں کے لوگوں کو نفاذ اسلام سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، کیا یہاں کے باشندے اپنی اور ملک کی ترقی کی خواہش سے محروم ہیں، کیا یہاں کے شہری نظم سیاسی کو اپنی منشا کے مطابق چلانے کی تمنا نہیں رکھتے؟ یا پھر یہ خطۂ ارضی آفات سماوی کا شکار ہے، یا اس کی سرزمین قدرتی وسائل سے خالی ہے؟ ان سوالوں کے جواب میں ہر شخص کہے گا کہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ یہ ملک افرادی وسائل سے مالا مال ہے۔قدرتی وسائل کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔اس سرزمین میں زراعت اور معدنیات کے حوالے سے ایسا تنوع اور تناسب پایا جاتا ہے کہ دنیا کے کم ممالک ایسی تقسیم کے حامل ہیں۔اس کے باسی صلاحیت اور جاں فشانی میں کسی سے کم نہیں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے مسلسل جدوجہد سے ایک ایسے ملک کو قائم کیا جسے دنیا ناممکن قرار دے رہی تھی۔ ملک وملت کی بقا کے لیے جب بھی کسی نے صدا لگائی ہے، اس کے افراد نے اپنی جانیں تک پیش کرنے سے گریز نہیں کیا۔ جمہوریت کے نعرے پر ہمیشہ لبیک کہا ہے۔ اسلام سے محبت کا یہ عالم رہا ہے کہ اگر کسی

طالع آزمانے بھی اسلام کا نعرہ لگایا تو اس پر بھی لبیک کہنے سے دریغ نہیں کیا۔

اگر معاملہ یہ ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ ۵۸ برس گزرنے کے باوجود ہم منزل تک رسائی تو کیا حاصل کرتے، نشانات منزل ہی کھو بیٹھے ہیں۔ اس تمام صورت حال کا صرف ایک سبب ہے اور وہ دینی اور دنیوی امور میں ہماری جہالت ہے۔

ہم اس ملک کو اسلام کی تجربہ گاہ نہیں بنا سکے تو اس کی وجہ دین کے بارے میں ہماری جہالت ہے۔ اس جہالت کا عالم یہ ہے کہ ہمارے عوام کا تصور دین مخصوص مکاتب فکر کی فقہی آرا کی پیروی تک محدود ہے۔ کہیں کلمات نماز کے بلند آہنگ یا کم آہنگ ہونے کا مسئلہ ہے، کہیں ازار کے ٹخنوں سے اوپر یا نیچے ہونے کا معاملہ ہے، کہیں داڑھی کے لمبا یا چھوٹا ہونے کا سوال ہے، کہیں عمامے اور ٹوپی کی جنگ ہے۔ خواص کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اسلام کی غلط تعبیرات سامنے آنے کی وجہ سے اسے ایک قصۂ پارینہ سمجھ کر دور جدید کے تقاضوں سے غیر ہم آہنگ قرار دیتے ہیں۔ جہاں تک علماے دین کا تعلق ہے تو ان کی اکثریت لوگوں کو سرگرم جنگ رکھنے پر مصر ہے۔ انھوں نے اس دوران میں کبھی اس کے لیے کوشش نہیں کی کہ لوگوں کو دین کے حقیقی شعور سے آگاہ کریں، ان کی اخلاقی تربیت کا اہتمام کریں اور انھیں حالات کے لحاظ سے حکمت عملی ترتیب دینے کی ترغیب دیں۔ اس زمانے میں بالخصوص ان کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ اسلام کے بارے میں جدید ذہن کے سوالات کا جائزہ لیتے اور عصر حاضر کے اسلوب میں ان کے تسلی بخش جوابات مرتب کرتے۔ المیہ یہ ہے کہ انھوں نے اس میدان میں علمی وفکری کام کرنے کے بجائے اپنی تمام تر توجہ سیاست کی حریفانہ کشمکش اور معاندانہ قوتوں کے خلاف جذباتی فضا قائم کرنے پر مرتکز رکھی ہے۔

اگر ہم اسے ایک فلاحی ریاست نہیں بنا سکے تو اس کی وجہ دنیوی امور کے بارے میں ہماری جہالت ہے۔ اپنے افراد کی عمومی تعلیم کے بارے میں ہم نے ہمیشہ غفلت اور بے اعتنائی کا رویہ اختیار کیا ہے۔ اس کے نتیجے میں ہمارے تمام طبقات بلا استثنا جہالت کا شکار ہیں۔ فلاحی ریاست کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ معاشرے کا اجتماعی نظام عادل، شفاف اور زندگی کی سہولتوں سے آراستہ ہو۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے ہم نے کبھی منصوبہ بندی نہیں کی۔ معاشرے کی ترقی کے لیے کن عوامل کی ضرورت ہوتی ہے، قانون پسندی کی کیا اہمیت ہے، اعلیٰ انسانی اقدار کس طرح اداروں میں ڈھلتی ہیں، رفاہی ادارے کس طریقے سے خدمت انجام دیتے ہیں، شہریوں کی ذمہ داریاں کیا ہوتی ہیں، ارباب حکومت کو کیا فرائض انجام دینے ہوتے ہیں، صحت، تعلیم اور روزگار کی سہولتیں بہم پہنچانے کے لیے

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

حکومت کو کیا منصوبہ بندی کرنا ہوتی ہے اور عوام کیسے اس عمل میں شریک ہوتے ہیں، امن عامہ کے مسائل کو کیسے حل کیا جاتا ہے، ظلم وعدوان کے خاتمے اور عدل وانصاف کے قیام کے لیے کیسے لائحۂ عمل تشکیل دیا جاتا ہے؟ یہ مسائل ہمارے فکروعمل کا کبھی حصہ نہیں بن سکے۔ اس زمانے میں کسی قوم کی مادی ترقی کا انحصار سرتاسر اس بات پر ہے کہ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں کس رفتار سے آگے بڑھ رہی ہے۔ دفاع، صنعت، زراعت اور رسل ورسائل کے معاملات میں سائنس اور ٹیکنالوجی ہی کی بنیاد پر ترقی کی جاسکتی ہے۔ مگر ہماری حالت اس میدان میں نہایت ابتر ہے۔ چنانچہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہماری غربت کا اصل سبب جدید سائنسی علوم سے بے اعتنائی ہے۔ فلاحی ریاست کا تصور امن عامہ کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ اس کے قیام کے لیے ضروری تھا کہ ہم عام اخلاقیات کے شعور سے بہرہ مند ہوں۔ ہماری تربیت ہونی چاہیے تھی کہ ایک شہری کی حیثیت سے ہماری کیا ذمہ داریاں ہیں، دوسروں کے حقوق کس طرح ادا کیے جاتے ہیں، قانون کی پاس داری کے فوائد اور قانون شکنی کے کیا نقصانات ہیں، دھوکا، فریب، عناد، ہٹ دھرمی اور حق تلفی سے کس طرح انسانی شخصیات مسخ ہوتی اور پورے معاشرے کے لیے امن وامان کا مسئلہ پیدا کر دیتی ہیں۔ ان پہلووں سے ہم آج تک نہ اپنی تربیت کر سکے اور نہ اس مقصد کے لیے کوئی لائحۂ عمل تشکیل دے سکے ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اگر ہم یہاں جمہوری اقدار کو مستحکم نہیں کر سکے تو اس کی وجہ سیاسی معاملات کے بارے میں ہماری جہالت ہے۔ ہمارے عوام کی اکثریت سیاسی شعور سے بے گانہ ہے۔ جمہوریت عوام کی سیاسی عمل میں بھرپور شرکت کا نام ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قوم کے افراد باہمی مشاورت سے اپنی ضرورتوں کا تعین کرتے، انھیں پورا کرنے کے لیے لائحۂ عمل تشکیل دیتے، اپنی تنظیم کرتے، تقسیم کار کے اصول پر اپنی ذمہ داریاں بانٹتے، اس مقصد کے لیے ادارے اور انجمنیں تشکیل دیتے اور پوری تن دہی کے ساتھ ملکی تعمیر میں سرگرم عمل ہو جاتے ہیں۔ قوم کا ہر فرد اس کام میں پورے شعور کے ساتھ شریک ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ہمارا معاملہ یہ ہے کہ کار پرداز عناصر عوام کو فریب دیتے اور عوام بڑی آسانی سے ان کے فریب میں آجاتے ہیں۔ جس فرد یا گروہ کے ہاتھ میں اقتدار آتا ہے، وہ اس پر بالجبر قابض رہنا چاہتا ہے اور اس مقصد کے لیے جمہوری اداروں کی پامالی کی پروا بھی نہیں کرتا۔ ایسے موقعوں پر عوام نہ موثر احتجاج کر پاتے اور نہ تبدیلی حالات کے لیے صحیح خطوط پر کوئی جدوجہد کر سکتے ہیں۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ بھی نہیں نکلتا کہ جمہوری ادارے بننے سے پہلے ہی ٹوٹ جاتے ہیں اور ملک پر سیاسی عدم استحکام کی فضا طاری رہتی ہے۔

اس تناظر میں ہم سمجھتے ہیں کہ ۱۹۴۷ء کے خواب کی حقیقی تعبیر کے لیے واحد راستہ تعلیم ہے۔ جب تک ہم دینی و دنیوی اعتبار سے اپنی جہالت سے چھٹکارا نہیں پا لیتے اور اس حقیقت کا ادراک نہیں کر لیتے کہ موجودہ زمانے میں تعلیم و تعلم ہی سے ترقی کے منازل طے کیے جا سکتے ہیں، اس وقت تک ہمارا یہ خواب، خواب ہی رہے گا۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ریحان احمد یوسفی

نو گیارہ سے سات سات تک

۱۱ستمبر ۲۰۰۱ جدید انسانی تاریخ کا ایک غیر معمولی دن تھا۔ اس دن دنیا کی تنہا سپر پاور کے دل و دماغ پر بیک وقت حملہ کیا گیا اور اس کے تجارتی مرکز اور دفاعی حصار پر سنگین ضرب لگائی گئی۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی اور پینٹاگون پر حملے کا جواب امریکہ نے افغانستان میں طالبان اور عراق پر صدام کی حکومت کے خاتمے اور ان پر قبضے کی شکل میں دیا۔ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو یقین تھا کہ مسلمان انتہا پسند ہی ان حملوں کے ذمہ دار ہیں۔ مسلمانوں میں اس بارے میں ایک سے زیادہ آرا پائی جاتی ہیں۔ بعض لوگ اسے اسامہ بن لادن کی کارروائی ہی سمجھتے ہیں، مگر اسے امریکہ کے ظالمانہ اقدامات کا شاخسانہ قرار دیتے ہیں۔ جبکہ بعض کے نزدیک یہ یہودی سازش تھی۔ کم و بیش یہی معاملہ ۷ جولائی کے سانحے کے بارے میں ہوا۔ اس روز لندن میں بم دھماکے ہوئے جس میں ۵۰ سے زیادہ بے گناہ افراد، جو ٹرینوں اور بسوں کے ذریعے سے اپنی روزمرہ مصروفیات کی جگہوں تک پہنچ رہے تھے، مارے گئے۔ اس حادثے کی ذمہ داری ''القاعدہ'' کی یورپی شاخ ہونے کی دعوے دار ایک تنظیم نے قبول کی۔ برطانوی حکام کے مطابق اس میں چار پاکستانی نژاد برطانوی نوجوان ملوث ہیں۔

ہم نہیں جانتے کہ امریکہ اور اس کے اتحادی اس حملے کا جواب کس شکل میں دیں گے، البتہ یہ بات یقینی ہے کہ وہ جو بھی جواب دیں گے، اس سے دنیا بھر میں مسلمانوں کے لیے مسائل ہی بڑھیں گے۔ دوسری طرف مسلمانوں میں ایک دفعہ پھر اس واقعے کے بارے میں دو آرا قائم ہو چکی ہیں۔ ایک طرف وہ لوگ ہیں جو برطانوی حکام کے دعووں کی تصدیق کر رہے ہیں، مگر اسے عراق اور افغانستان پر حملوں کا جواب قرار دے رہے ہیں۔ دوسری طرف

نظریۂ سازش پر یقین رکھنے والے مسلمان ہیں جونت نئی تھیوریز پیش کر کے اس واقعے کی ذمہ داری برطانوی خفیہ ایجنسیوں پر ڈال رہے ہیں۔ مثلاً ایک تھیوری یہ ہے کہ ۶ جولائی کو لندن نے اولمپک کی میزبانی کا اعزاز حاصل کیا۔ چنانچہ ضروری تھا کہ لندن کی ریلوے کا نظام از سر نو تعمیر کیا جائے۔ چنانچہ ایک طرف یہ دھماکے کروا کے انشورنس اور دوسرے ذرائع سے ریلوے سسٹم کی تعمیر نو کے فنڈز حاصل کیے گئے اور دوسری طرف مسلمانوں کے خلاف نئے اقدامات کے لیے بہانہ بھی مل گیا۔ ان لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ مسلمان ایک عرصے سے سامراج کی بربریت کا شکار ہیں۔ انھوں نے پہلے پورے عالم اسلام پر قبضہ کیا، پھر عالم اسلام کے قلب میں اسرائیل کا خنجر گاڑا۔ اس کے جواب میں مسلمانوں نے احتجاج کیا تو اس احتجاج کو غیر موثر بنانے اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لیے نو گیارہ اور سات سات جیسے واقعات کرائے گئے۔

برطانوی حکام کے دعووں اور نظریۂ سازش کے علم برداروں کے اختلاف سے قطع نظر ہم قارئین کی توجہ ایک بہت اہم بات کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں۔ اس وقت امت مسلمہ کی پوری فکری اور مذہبی قیادت جس نقطۂ نظر کی قائل ہے، وہ یہ ہے کہ مسلمان دنیا میں خدائی فوج دار ہیں۔ وہ پہلے اپنے ملکوں میں اسلامی نظام قائم کرنے کے مکلّف ہیں اور پھر پوری دنیا کو مغلوب کرنا بھی ان کی ذمہ داری ہے۔ وہ ان ملکوں کو پہلے دعوت دیں گے اور اگر انھوں نے دعوت قبول نہ کی تو مسلمان بزور شمشیر ان ملکوں کو فتح کر کے وہاں اسلام کی حکمرانی قائم کریں گے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اس نقطۂ نظر میں کیا علمی مغالطے ہیں اور کس طرح سیرت طیبہ اور خلفاے راشدین کے بعض اقدامات کو درست طور پر نہ سمجھنے کی بنا پر یہ غلطی لگی ہے، ہم سر دست اس بحث کو جانے دیتے ہیں، لیکن ایک لمحے کے لیے یہ مان لیجیے کہ یہی نقطۂ نظر درست ہے تو بتائیے کہ جو طاقتیں اس وقت دنیا میں غالب ہیں، ان کا رویہ مسلمانوں کے بارے میں کیا ہونا چاہیے۔ کیا ان طاقتوں کی اولین کوشش یہ نہیں ہونی چاہیے کہ وہ مسلمانوں کو آپس میں لڑا کر ان کی طاقت کو مفلوج کریں۔ ان کے وسائل پر قبضہ کر کے انھیں بے دست و پا کر دیں۔ جدید ٹیکنالوجی سے انھیں محروم رکھنے کی سعی کریں۔ ان کے جسد پر قبرص، فلسطین، کشمیر، چیچنیا اور مشرقی تیمور کے گھاؤ لگائیں۔ جہاں اس نقطۂ نظر کے لوگ حکومت میں آ جائیں، ان ملکوں پر فوراً قبضہ کر لیں۔ جن تعلیمی اداروں میں اس نقطۂ نظر کو فروغ دیا جاتا ہے، ان کی بیخ کنی کرنے کی کوشش کریں۔

اگر ان کے یہ اقدامات ظالمانہ ہیں تو ہم سوال کرتے ہیں کہ اگر پاکستان میں رہنے والے قادیانی یا کوئی اور اقلیت یہ طے کر لے کہ اسے پاکستان کے اقتدار پر قبضہ کر کے یہاں کے مسلمانوں کو مغلوب کرنا ہے تو ہمارا رویہ کیا

ہوگا؟ ہماری حکومت اس کے ساتھ کیا کرے گی؟ کیا ہم وہی کچھ نہیں کریں گے جو آج دنیا کی طاقتیں ہمارے ساتھ کررہی ہیں؟

ہم مغرب کے کسی ظالمانہ اقدام کی تائید نہیں کرتے، مگر اپنے لوگوں کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ حقائق کی دنیا کیا ہوتی ہے۔ دوسروں پر نظریۂ سازش کا الزام لگانے سے پہلے یہ جان لینا چاہیے کہ ہم خود دوسروں کے بارے میں کیا عزائم رکھتے ہیں۔ خدا کی دنیا میں یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ دوسروں کی بربادی کے منصوبے بنائیں اور وہ آپ کو پھولوں کے ہار پہنائیں۔ آپ دوسروں کو مغلوب کرنے کا اعلان کریں اور وہ خاموشی سے بیٹھے آپ کے عزائم کی تکمیل کا انتظار کریں۔ وہ آگے بڑھیں گے اور خطرے کو بڑھنے سے پہلے ہی ختم کردیں گے۔

ہمارے قائدین کو اتنا معصوم نہیں ہونا چاہیے کہ وہ ان واضح حقائق کو نہ سمجھ سکیں۔ نائن الیون کے بعد ہمارے پاس وقت تھا کہ ہم اس بارے میں بحث ومباحثہ شروع کرتے کہ امت کا نصب العین سمجھنے میں ہم سے کوئی غلطی تو نہیں ہوگئی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم اپنی کوتاہیوں کے سبب خدا کے عذاب کی زد میں آچکے ہوں، مگر بدقسمتی سے اس کے بجائے ہمارے ہاں یہ بحث شروع ہوگئی کہ یہ حملے اسامہ بن لادن نے نہیں کیے، بلکہ یہ ایک یہودی سازش ہے۔ اور اگر کیے ہیں تو امریکہ کے ظلم کے خلاف کیے ہیں۔ اسی پر پوری قوم کا اجماع ہوگیا۔ کسی نے اس کے خلاف بات کرنے کی کوشش کی تو اسے امریکی ایجنٹ قرار دے دیا گیا۔ اب سیون سیون کے بعد ایک دفعہ پھر ہمارے پاس وقت ہے کہ ہم کوئی سازش دریافت کرنے کے بجائے اپنے اور دیگر قوموں کے تعلق کی حقیقت کو سمجھیں کہ یہ داعی اور مدعو کا تعلق ہے نہ کہ حاکم اور محکوم کا۔ ہم اپنے نقطۂ نظر کی غلطی دریافت کریں۔ اسلام کی دعوت کو پرامن طور پر پھیلانے کی منصوبہ بندی کریں۔ قوم وملت کی تعمیر کے لیے اسے ٹکراؤ کے بجائے تیاری کے میدان میں لے آئیں۔ یہی ہماری اولین ذمہ داری ہے۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آل عمران

(۱۹)

(گزشتہ سے پیوستہ)

وَ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا، اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ، يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ، وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ،

ایمان[۱۶۷] والو، تم اِن اہل کتاب کے ایک گروہ[۱۶۸] کی بات مان لو گے تو تمھارے ایمان کے بعد یہ پھر تمھیں کفر کی طرف پھیر لے جائیں گے[۱۶۹]۔ (اِس پر متنبہ رہو) اور (غور کرو کہ) تمھارا کفر میں پڑنا کس

[۱۶۷] سورہ کی پہلی فصل آیت ۹۹ پر ختم ہوئی۔ یہاں سے دوسری فصل شروع ہو رہی ہے۔ پہلی فصل میں خطاب اہل کتاب سے تھا۔ ان پر اتمام حجت کے بعد اس آیت سے خطاب کا رخ مسلمانوں کی طرف ہو گیا ہے۔ چنانچہ اس دوسری فصل میں اب پہلے مسلمانوں کو اہل کتاب کی ان گمراہ کن چالوں سے خبردار کیا گیا ہے جو وہ حق کے راستے سے ان کو ہٹانے کے لیے اختیار کر رہے تھے۔ اس کے بعد تزکیہ و تطہیر کا مضمون شروع ہوتا ہے جس میں ان کو امتحان کے اس مرحلے میں کامیابی کے لیے ضروری ہدایات دی گئی ہیں اور یہ حقیقت ان پر واضح کی گئی ہے کہ اسلام کی پیروی کا صحیح حق وہ اللہ کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ تھام کر اور آزمایش کے موقعوں پر اللہ و رسول کی اطاعت پر پوری طرح قائم رہ کر ہی ادا کر سکتے ہیں۔

[۱۶۸] اس سے اہل کتاب کا وہی گروہ مراد ہے جس کی مخالفتوں اور وسوسہ اندازیوں کا ذکر اوپر تفصیل سے ہوا

وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ، وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿١٠١﴾
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا، اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ، وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ

طرح جائز ہوسکتا ہے، جب کہ تمھیں اللہ کی آیتیں سنائی جارہی ہیں اور اُس کا رسول تمھارے اندر موجود ہے[۱۷۰]۔ (لہٰذا اللہ کو مضبوطی سے پکڑے رہو) اور (یاد رکھو کہ) جو اللہ کو مضبوطی سے پکڑے گا[۱۷۱] تو (سمجھ لو کہ) اُس نے سیدھی راہ کو پالیا ہے۔۱۰۰-۱۰۱

ایمان والو، اللہ سے ڈرو، جیسا کہ اُس سے ڈرنے کا حق ہے[۱۷۲]، اور دنیا سے رخصت ہو تو ہر حال میں

ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک گروہ اہل انصاف کا بھی تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات ہر جگہ ملحوظ رکھی ہے کہ ان کے ساتھ کوئی بے انصافی نہ ہونے پائے۔

[۱۶۹] یعنی تم سمجھتے ہو کہ یہ دین کے ماننے والے ہیں، اس لیے کسی کو گمراہ کرنے کی بات کس طرح سوچ سکتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی تمام دین داری رسمی ہے۔ یہ اصل دین کے ایسے پکے دشمن ہیں کہ خود بھی منکر ہیں اور ان کی باتوں میں آؤ گے تو تمھیں بھی اس کا منکر بنا کر چھوڑیں گے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

[۱۷۰] مطلب یہ ہے کہ اس کے باوجود حق کو چھوڑتے ہو تو یہ تمھاری انتہائی محرومی اور بدبختی ہوگی۔ اللہ کے حضور میں پیش کرنے کے لیے اس کے بعد کوئی عذر تمھارے لیے باقی نہ رہے گا۔ اس کے معنی تو پھر یہی ہوں گے کہ تم نے پورے دن کی روشنی میں ٹھوکر کھائی ہے۔

[۱۷۱] اللہ کو مضبوطی سے پکڑنے کا مفہوم یہ ہے کہ نرم و گرم، ہر طرح کے حالات میں آدمی جادۂ حق پر قائم رہے اور اللہ تعالیٰ کے احکام و ہدایات اور اس کی کتاب سے کسی حال میں روگردانی نہ کرے۔

[۱۷۲] یہ اللہ کو مضبوطی سے پکڑنے کی حقیقت واضح فرمائی ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ سے اس طرح ڈرتے رہو، جس طرح اس سے ڈرتے رہنے کا حق ہے۔ استاذ امام اس کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

"... یہ تقویٰ اگرچہ مطلوب تو اسی حد تک ہے جس حد تک بندے کی استطاعت میں ہے، اس کی وضاحت خود قرآن ہی نے فرما دی ہے کہ 'فاتقوا اللّٰہ ما استطعتم'*۔ لیکن خدا سے ڈرنے اور دوسروں سے ڈرنے میں بڑا فرق ہے، اس وجہ سے ارشاد ہوا کہ خدا سے ڈرتے رہو، جس طرح خدا سے ڈرتے رہنے کا حق ہے۔ اول تو بندے

---

* التغابن ۶۴: ۱۶۔

مُّسۡلِمُوۡنَ ﴿۱۰۲﴾ وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰہِ جَمِیۡعًا، وَّلَا تَفَرَّقُوۡا، وَاذۡکُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ، اِذۡ کُنۡتُمۡ اَعۡدَآءً، فَاَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِکُمۡ، فَاَصۡبَحۡتُمۡ بِنِعۡمَتِہٖۤ اِخۡوَانًا،

اسلام پر رخصت ہو۔[۱۷۳] اور اللہ کی رسی[۱۷۴] کو سب مل کر مضبوطی سے پکڑ واور تفرقہ میں نہ پڑو، اور اپنے اوپر اللہ کی اُس عنایت کو یاد رکھو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اُس نے تمھارے دل جوڑ دیے اور اُس کے

پر خدا کے جو حقوق ہیں، وہ کسی اور کے نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ خدا نے جو حدود و قیود قائم کیے ہیں اور ان کے توڑنے کی جو سزا مقرر کی ہے، وہ تمام تر بندوں کی دنیوی و اخروی بہبود کے لیے کی ہے، ان کی پابندی سے خدا کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، بلکہ بندوں ہی کو پہنچتا ہے۔ تیسری یہ کہ خدا کی آنکھیں ہر جگہ نگراں ہیں، یہاں تک کہ وہ دلوں کے وسوسوں سے بھی باخبر ہے۔ چوتھی یہ کہ خدا کی پکڑ سے کوئی دوسرا بچا نہیں سکتا اور وہ دنیا اور آخرت، دونوں میں سزا دے سکتا ہے اور ہمیشہ کے لیے دے سکتا ہے۔ خدا سے ڈرنے میں جب تک بندہ ان تمام پہلوؤں کو مد نظر نہ رکھے وہ خدا سے ڈرنے کا صحیح مفہوم سمجھ بھی نہیں سکتا، چہ جائیکہ وہ اس کا صحیح حق ادا کر پائے۔ بہت سے لوگ جو انسانوں سے ڈر کر خدا اور اس کی شریعت کو چھوڑ بیٹھتے ہیں، ان کی بنیادی گمراہی یہی ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی مخالفت اور خدا کے غضب میں فرق نہیں کر پاتے۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۱۵۲)

[۱۷۳] یعنی خدا سے یہ ڈرنا اور اس کی اطاعت پر قائم رہنا زندگی بھر کا معاملہ ہے۔ اس میں کسی انقطاع کی گنجایش نہیں ہے۔ شعور کی عمر کو پہنچنے کے بعد یہ جدوجہد شروع ہوگی اور زندگی کی آخری سانس تک جاری رہے گی۔ لہٰذا خبردار رہو، اتمام سے ذرا پہلے بھی اگر اس کا سلسلہ ٹوٹ گیا تو ساری محنت برباد ہو جائے گی۔

استاذ امام نے اس کا ایک اور پہلو بھی واضح فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''... آیت کے اسلوب میں یہ بات بھی مخفی ہے کہ یہ راہ بہت ہموار نہیں ہے، بلکہ اس میں بہت سے نشیب و فراز اور ہر قدم پر اتار چڑھاؤ ہیں۔ اس میں آزمایشوں اور فتنوں سے دوچار ہونا ہوگا اور شیاطین کے شب خونوں اور معاندین کی دراندازیوں اور فساد انگیزیوں سے سابقہ پیش آئے گا۔ کبھی طمع ورغلانے کے لیے عشوہ گری کرے گی۔ کبھی خوف دھمکانے کے لیے اپنے اسلحہ سنبھالے گا۔ جو ان سب مرحلوں سے اپنا ایمان و اسلام بچاتا ہوا منزل پر پہنچا اور اسی حال میں اس نے جان، جان آفریں کے سپرد کی، درحقیقت وہ ہے جو خدا سے اس طرح ڈرا، جس طرح خدا سے ڈرنے کا حق ہے اور یہی ہے جس کو اعتصام باللہ کا مقام حاصل ہوا۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۱۵۲)

[۱۷۴] اس سے مراد یہاں قرآن ہے، اس لیے کہ یہی وہ رسی ہے جو آسمان سے زمین تک خدا اور اس کے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ، فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا. كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ، لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ، يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ، وَيَاْمُرُوْنَ

فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے، اور (یاد رکھو کہ) تم آگ کے ایک گڑھے کے بالکل کنارے پر کھڑے تھے، پھر اُس نے تم کو اُس سے بچا لیا۔[۱۷۵] اللہ اِسی طرح اپنی آیتیں تمھارے لیے واضح کرتا ہے تاکہ تم ہدایت پر رہو۔[۱۷۶] اور چاہیے کہ تمھارے اندر سے کچھ لوگ مقرر رہوں جو نیکی کی دعوت دیں، بھلائی کی

بندوں کے درمیان تنی ہوئی ہے۔ ہمارے اور ہمارے رب کے درمیان یہی واسطہ اور یہی عہد و میثاق ہے۔ چنانچہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑنے کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم اس کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑیں اور کسی حال میں اس سے الگ نہ ہوں۔ پھر اس کے ساتھ 'جمیعاً' کی قید اور 'لا تفرقوا' کی نہی بھی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں سے یہ مطالبہ ان کی اجتماعی حیثیت میں ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ وہ سب مل کر اس رسی کو مضبوطی سے تھامیں اور اس کو چھوڑ کر اپنے شیرازے کو پراگندہ نہ کریں، بلکہ ایک جمعیت بن کر قرآن سے وابستہ ہوں، اسے پڑھیں، اس کی آیتوں پر تدبر کریں، اس سے نصیحت حاصل کریں، خدا کی اتاری ہوئی ایک میزانِ عدل کی حیثیت سے اپنے تمام معاملات میں اسی کو مرجع بنائیں اور اس کے کسی حکم یا فیصلے کے سامنے کسی دوسری چیز کو ہرگز کوئی وقعت نہ دیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

[۱۷۵] یہ اس عظیم احسان کی یاد دہانی ہے جو قرآن کے ذریعے سے عربوں پر ہوا۔ اس کتاب کے نازل ہونے سے پہلے ان کا ہر قبیلہ دوسرے قبیلے کا دشمن تھا اور یہ باہم جنگ و جدال برپا کیے رہتے تھے۔ مذہبی حیثیت سے بھی ان کے مابین وحدت کا کوئی رشتہ باقی نہ رہا تھا۔ ہر قبیلے نے اپنے دیوتا الگ کر لیے تھے اور سیاست و معیشت میں بھی ان کے مفادات باہم متصادم تھے۔ لیکن قرآن کی صورت میں یہ رسی ان کے ہاتھوں میں پکڑا دی گئی تو استاذ امام کے الفاظ میں اس نے ان کو ایک رشتے میں پرو کر موتیوں کی لڑی بنا دیا اور وہ جو ایک دوسرے کے دشمن تھے، ایک دوسرے کے جگری دوست اور غم خوار بھائی بن گئے۔

[۱۷۶] مطلب یہ ہے کہ اس وضاحت کے ساتھ یہ یاد دہانی اس لیے کی گئی ہے کہ اس معاملے میں معمولی غلطی بھی بڑے غیر معمولی فتنوں کا باعث بن سکتی ہے، لہٰذا متنبہ رہو کہ اگر وحدت و محبت کی اس حالت کو باقی رکھنا چاہتے ہو تو اس کتاب کو مضبوطی سے پکڑے رکھنا ضروری ہے، ورنہ جاہلیت کی اسی حالت کو لوٹ جاؤ گے جس میں تم اس سے پہلے مبتلا رہ چکے ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ تم آگ کے ایک گڑھے کے بالکل کنارے پر کھڑے تھے کہ تمھارے پروردگار

بِالْمَعْرُوْفِ، وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ، وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾
وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا، وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ،
وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۰۵﴾ يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ، وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ، فَاَمَّا
الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ، اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ، فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا
كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ، فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ، هُمْ فِيْهَا

تلقین کریں اور برائی سے روکتے رہیں۔ (تم یہ اہتمام کرو) اور (یاد رکھو کہ جو یہ کریں گے) وہی فلاح پائیں گے۔[177] ۱۰۲-۱۰۴

(تم یہ کرو) اور اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو فرقوں میں بٹ گئے اور جنھوں نے نہایت واضح ہدایات اپنے پاس آجانے کے بعد اختلاف کیا[178] اور (اب) وہی ہیں کہ جن کے لیے بڑی سخت سزا ہے، اُس دن جب کچھ چہرے روشن ہوں گے اور کچھ چہروں پر تاریکی چھا رہی ہوگی۔ سو جن پر تاریکی چھا رہی ہوگی، (اُن سے پوچھا جائے گا): کیا تم ایمان کی نعمت سے بہرہ یاب ہونے کے بعد پھر کافر ہو گئے؟ تو اپنے اِس کفر کی پاداش میں اب چکھو عذاب کا مزہ۔ رہے وہ جن کے چہرے روشن ہوں گے تو

نے تمھارا ہاتھ تھام کر تم کو اس سے بچا لیا۔ اب اس کتاب کو چھوڑو گے تو اندیشہ ہے کہ اسی گڑھے میں گرو گے اور اس کی آتش سے کسی طرح بچ نہ سکو گے۔

[۱۷۷] یہ مسلمانوں کو ان کی اجتماعی حیثیت میں حکم دیا ہے کہ اس ہدایت پر قائم رہنے کے لیے اپنے اندر سے کچھ لوگوں کو مقرر کریں جو انھیں بھلائی کی تلقین کرتے اور برائی سے روکتے رہیں۔ اس سے واضح ہے کہ یہ حکم ارباب اقتدار سے متعلق ہے۔ چنانچہ اسلامی ریاست میں جمعہ کا منبر اور پولیس کا محکمہ یہی خدمت انجام دیتے ہیں۔ خطبۂ جمعہ کے ذریعے سے مسلمانوں کے ارباب حل وعقد انھیں بھلائی کی دعوت دیتے اور برائیوں سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں اور پولیس ایسے منکرات کا ارتکاب کرنے والوں کا محاسبہ کرتی ہے جنھیں قانون کی رو سے جرم قرار دیا جاتا ہے۔

[۱۷۸] یعنی محض سرکشی کے باعث انھیں ماننے سے انکار کر دیا۔ آگے اسی کو ایمان کے بعد پھر کافر ہو جانے سے تعبیر کیا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

خٰلِدُوْنَ﴿۱۰۷﴾تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ، وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ﴿۱۰۸﴾وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ، وَمَا فِي الْاَرْضِ، وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ﴿۱۰۹﴾

اُن کی جگہ اللہ کی رحمت کے سایے میں ہو گی، وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو ہم تمھیں ٹھیک ٹھیک سنا رہے ہیں، اور (اِس لیے سنا رہے ہیں کہ) اللہ نہیں چاہتا کہ وہ دنیا والوں پر کوئی ظلم کرے۔ (لہٰذا اِن اہل کتاب کی طرح جھوٹی امیدوں میں نہ رہو) اور (یاد رکھو کہ) زمین و آسمان میں جو کچھ ہے، سب اللہ ہی کا ہے اور تمام معاملات اللہ ہی کے حضور میں پیش کیے جاتے ہیں[179]۔ ۱۰۵۔۱۰۹

---

[۱۷۹] اس پیرے کی آیتوں پر غور کیا جائے تو اس سے جو حقائق سامنے آتے ہیں، وہ استاذ امام کے الفاظ میں یہ ہیں:

''اول یہ کہ اعتصام بحبل اللہ سے محروم ہو جانے کے بعد اہل کتاب اختلاف و انتشار میں مبتلا ہوئے اور یہ انتشار و اختلاف درحقیقت ایمان کے بعد کفر کی طرف پلٹ جانے کے ہم معنی ہے۔

دوم یہ کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ یہ سرفرازی و سرخ روئی بخشتا ہے کہ ان کے ہاتھ میں خود اپنی رسی پکڑاتا ہے، اگر وہ اپنی شامت اعمال سے اس رسی کو چھوڑ کر دوسرے پھندے اپنی گردنوں میں ڈال لیتے ہیں تو قیامت کے دن ان کو اسی درجے کی روسیاہی بھی حاصل ہو گی جس درجے کی ان کو سرخ روئی بخشی گئی تھی۔ چہرے روشن ان کے ہوں گے جو ہر طرح کے حالات میں اس رسی کو تھامے رہیں گے۔ یہ لوگ، بے شک اللہ کے فضل و رحمت کے حق دار ہوں گے۔

سوم یہ کہ یہ ساری تنبیہات بالحق ہیں یعنی ہر بات شدنی ہے۔ ان کو محض خالی خولی دھمکی سمجھ کر جو لوگ نظر انداز کریں گے، وہ اپنی روسیاہی کا سامان خود کریں گے اور اس کی تمام تر ذمہ داری انھی پر ہو گی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آگاہی پہلے سے اسی لیے سنا دی ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا کہ کسی کو سزا اس پر حجت تمام کیے بغیر دے۔

چہارم یہ کہ آسمان و زمین میں سارا اختیار صرف اللہ تعالیٰ ہی کا ہے۔ سارے امور اسی کے حضور پیش ہوں گے اور اسی کا فیصلہ ناطق و نافذ ہو گا۔ اگر کسی نے کسی اور سے امید باندھ رکھی ہو تو اس کی یہ امید محض ایک واہمہ ہے جو حقیقت کے ظہور کے بعد بالکل سراب ثابت ہو گی۔'' (تدبر قرآن ۲/۱۵۵)

[باقی]

معز امجد

قریش کی حکمرانی کے بارے میں روایت

روی[1] أن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم قال لقريش: إن هذا الأمر فيكم[2]، وأنتم ولاته ما لم تحدثوا عملاً[3] ينزعه اللّٰه منكم، فإذا فعلتم ذلك سلط[4] اللّٰه عليكم شرار خلقه فالتحوكم[5] كما يلتحى القضيب.

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

”روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش سے فرمایا: حکمرانی کا یہ معاملہ اس وقت تک تمھارے درمیان رہے گا اور تم ہی اس معاملے کے نگران رہو گے[1] جب تک کہ تم کوئی ایسا کام نہ کرو کہ اللہ تمھیں اس سے ہٹا دے[2]۔ جب تم ایسا کرو گے تو خدا اپنی بدترین مخلوق[3] تم پر مسلط کر دے گا جو تمھیں اس طرح چھیل کے رکھ دے گی جیسے شاخ کو چھیلا جاتا ہے[4]۔“

ترجمے کے حواشی

۱۔ اس سے پہلے یہ وضاحت ہو چکی ہے کہ قریش کو چونکہ بنی اسماعیل کے تمام قبائل کا سیاسی اعتماد حاصل تھا، اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ’أمرهم شورىٰ بينهم‘ (ان کے معاملات باہمی مشاورت پر مبنی ہیں) کے قرآنی اصول کے تحت لوگوں کو آگاہ کر دیا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بنی اسماعیل کے سیاسی معاملات کی

ذمہ داری قریش کے کاندھوں پر ہوگی۔

۲۔یعنی حکمرانی کا یہ منصب انھیں خدا کی طرف سے حاصل ہوا ہے اور یہ اس وقت تک انھیں حاصل رہے گا جب تک وہ خدا کے قوانین کے پابند رہیں گے۔

۳۔یعنی ظالم لوگ۔

۴۔قرآن مجید (۱۷: ۴۔۸ اور ۲: ۱۴۳) کے مطابق بنی اسرائیل کی طرح بنی اسماعیل بھی خدا کی طرف سے شہادت علی الناس کے منصب پر فائز ہیں۔اس کے تحت اگر یہ حق پر قائم رہیں تو اللہ تعالیٰ انھیں دوسری قوموں پر غلبہ عطا فرماتے ہیں اور اگر حق سے انحراف کریں تو دوسری قوموں کے ذریعے سے ذلت اور محکومی کے عذاب میں مبتلا کر دیے جاتے ہیں۔قریش کو چونکہ بنی اسماعیل کے نمائندوں کی حیثیت حاصل ہے، اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس روایت میں انھیں خدا کے اس قانون کے بارے میں خبردار کیا ہے۔

متن کے حواشی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۱۔ یہ روایت اپنی اصل کے اعتبار سے ابن ابی شیبہ، رقم ۳۷۷۱۸ ہے۔بعض اختلافات کے ساتھ یہ درج ذیل مقامات پر نقل ہوئی ہے:

احمد بن حنبل، رقم ۱۷۱۱۰، ۲۲۴۰۹، ۲۲۴۱۵۔عبدالرزاق، رقم ۱۹۹۰۳۔بیہقی، رقم ۱۶۳۱۲، ۱۶۳۲۳۔

۲۔بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۲۲۴۰۹ میں ’إن هذا الأمر فيكم‘ (یہ معاملہ تمھارے اندر رہے گا) کے بجائے ’إن هذا الأمر لا يزال فيكم‘ (یہ معاملہ تمھارے اندر جاری رہے گا) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

۳۔بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۱۷۱۱۰ میں ’ما لم تحدثوا عملا‘ (جب تک کہ تم کوئی ایسا معاملہ نہ کرو) کے بجائے ’ولن يزال فيكم حتي تحدثوا أعمالا‘ (یہ معاملہ تمھارے درمیان ہی رہے گا، یہاں تک کہ تم ایسے اعمال نہ کرو) کے الفاظ نقل ہوئے ہیں۔

۴۔بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۱۷۱۱۰ میں ’سلط‘ (مسلط کرنا) کے بجائے ’بعث‘ (اٹھانا) کا لفظ روایت ہوا ہے۔

۵۔ بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۱۱۰۱۷ میں 'فالتحوکم' (تو وہ تمھیں چھیل دیں گے) کے بجائے 'فیلتحیکم' (تو وہ تمھیں چھیل دیں گے) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بیہقی، رقم ۱۶۳۲۳ میں یہ روایت یوں نقل ہوئی ہے:

أنتم أولى الناس بهذا الأمر ما كنتم مع الحق إلا أن تعدلوا عنه فتلحون كما تلحى هذه الجريدة يشير إلى جريدة بيده.

''اگر تم حق پر قائم رہو تو (حکمرانی کے) اس معاملے کے تم تمام لوگوں سے زیادہ حق دار ہو اور اگر تم حق سے ہٹو گے تو اس طرح چھیل دیے جاؤ گے جیسے یہ ٹہنی چھیلی جاتی ہے۔ یہ کہتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ٹہنی کی طرف اشارہ کیا۔''

عبدالرزاق، رقم ۱۹۹۰۳ کے مطابق یہ روایت اس طرح ہے:

روى أن النبي صلى الله عليه وسلم مر بنفر من قريش ووجوههم كأنها سبائك الذهب فجعل يوصيهم فقال إنكم لن تزالوا بخير ما أتقيتم الله وحفظتم أمره من ترك ذلك منكم لحاه الله كما لحا هذا العود وجعل النبي صلى الله عليه وسلم يلحو عودا كان في يده لم يترك فيه شيئا.

''روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے ایک گروہ کے پاس سے گزرے جن کے چہرے گویا سونے کی اینٹوں جیسے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: تم اس وقت تک بھلائی پر رہو گے جب تک تم خدا سے ڈرتے رہو اور اس کے احکامات کی پابندی کرو۔ تم میں سے جو بھی اس سے پھرا تو اللہ اسے اس لکڑی کی طرح چھیل کے رکھ دے گا۔ تب آپ نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی لکڑی کو چھیلنا شروع کیا، یہاں تک کہ اس میں سے کچھ بھی باقی نہ بچا۔''

---

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

طالب محسن

کلمۂ توحید اور جنت

(مسلم، رقم ۲۶)

عن عثمان رضی اللّٰہ عنہ قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: من مات، وھو یعلم أنہ لا إلٰہ إلا اللّٰہ، دخل الجنة.

''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو اس طرح فوت ہوا کہ وہ جانتا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، وہ جنت میں داخل ہوا۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

لغوی مباحث

وھو یعلم: وہ جانتا ہے۔ یہ فعل یہاں اپنے کامل معنی میں آیا ہے۔ یعنی پوری طرح جان لینا۔ نحوی اعتبار سے یہ حال کے محل پر ہے۔

إلٰہ: وہ ہستی جس کی پرستش کی جاتی ہے۔ یعنی اسے اسباب سے ماورا قدرت کا اہل مانتے ہوئے اس کی رضا حاصل کرنے کے لیے نذر نیاز، تذلل، تضرع اور دعا و مناجات کی مختلف رسوم ادا کی جاتی ہیں۔

معنی

یہ روایت اپنے ظاہری معنی میں قرآن مجید اور بہت سی دوسری روایات کے خلاف ہے۔ قرآن مجید صریح الفاظ

میں بیان کرتا ہے کہ آخرت کی کامیابی ایمان اور عمل صالح پر منحصر ہے۔ یہ بات قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان ہوئی ہے۔کئی روایات بھی اسی مضمون کی حامل ہیں۔لیکن اس کے ساتھ ایسی روایات بھی کتب حدیث میں منقول ہیں جن میں وہی بات بیان ہوئی ہے جو زیر بحث روایت میں منقول ہے۔ غالباً انھی روایات کے باعث امت میں یہ بات زیر بحث رہی ہے کہ معصیت کے ارتکاب پر صاحب ایمان کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا۔امام نووی نے اس حدیث کی شرح کے تحت مختلف گروہوں کی آرا تلخیصاً نقل کی ہیں:

''اہل شہادت میں سے جو اللہ کی نافرمانی کا مرتکب ہوا ہو، اس کے بارے میں لوگوں نے مختلف آرا قائم کی ہیں۔ مرجئہ کی رائے یہ ہے کہ معصیت ایمان کے ساتھ ضرر رساں نہیں ہے۔خوارج کے نزدیک ضرر رساں ہے اور اس سے وہ کافر ہو جاتا ہے۔معتزلہ کہتے ہیں کہ اگر معصیت کبیرہ ہو تو ہمیشہ کے لیے جہنمی ہے۔ اسے نہ مومن کہا جائے گا نہ کافر، بلکہ فاسق کہا جائے گا۔اشعریہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ وہ مومن ہے اگرچہ اللہ اسے معاف نہ کریں اور عذاب دیں۔مزید برآں وہ ہر حال میں جہنم سے نکلے گا اور جنت میں جائے گا۔'' (شرح نووی ۱/۲۱۸)

اسی طرح شارحین حدیث نے اس تضاد کو دور کرنے کے لیے مختلف حل پیش کیے ہیں۔ایک حل یہ ہے کہ آپ کا یہ ارشاد اس دور سے متعلق ہے جب ابھی اوامر ونواہی نہیں اترے تھے۔ظاہر ہے، یہ حل ناقابل قبول ہے۔اس لیے کہ اس مضمون کی روایات کے راوی حضرت معاذ، حضرت عبادہ بن صامت اور حضرت ابوہریرہ بھی ہیں۔ان میں سے عبادہ بن صامت کی روایت: 'من شهد أن لا إله إلا الله وأن محمدا رسول الله دخل الجنة ' (جس نے گواہی دی کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں، وہ جنتی ہے۔) ایسی روایت ہے جو انھوں نے اپنی موت کے وقت بیان کی ہے۔اسی طرح حضرت ابوہریرہ کی روایت تو مدینہ ہی سے متعلق ہے اور ابوہریرہ شریعت کے احکام کے نزول کے بعد کے زمانے میں ایمان لائے ہیں۔غرض یہ کہ یہ حل حقیقت میں کوئی حل نہیں ہے۔

دوسرا حل یہ ہے کہ اس طرح کی روایات میں 'خلود فی النار' (یعنی ہمیشہ کی جہنم) کی نفی کی گئی ہے۔ یہ بات بھی محل نظر ہے۔ یہ حل زیر بحث روایت میں تو قبول کیا جا سکتا ہے۔لیکن اس روایت کی کیا تاویل ہوگی جس میں آگ پر حرام کیے جانے کی نوید سنائی گئی ہے۔

اصل یہ ہے کہ ان روایات میں نہ محض ایمان کو یقینی نجات کی ضمانت قرار دیا گیا ہے اور نہ اہل ایمان کے لیے دوزخ سے نکل آنے کے امکان کی خبر دی گئی ہے۔اس روایت کو سمجھنے کے لیے متکلم کی شخصیت کو پیش نظر رکھنا ضروری

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایمان اور بطور خاص توحید اور رسالت پر ایمان کی دعوت کوئی سادہ مطالبہ نہیں ہے۔عرب کے معاشرے میں جو نامعلوم عرصے سے توحید کے صحیح تصور اور شریعت کی بیش تر تعلیمات سے محروم ہو چکا تھا، ایک فرد کا توحید پر ایمان، بعض روایات کے مطابق اس کا برملا اظہار اور ایک شخص کو خدا کا پیغمبر مان لینا ایک نئ زندگی گزارنے کا سرعنوان تھا۔ یہ ایک بڑا فیصلہ تھا۔ایک ایسا فیصلہ جس کی قیمت تمام دنیوی مفادات سے محرومی ہو سکتی تھی۔ چنانچہ توحید کی معرفت اور اس کے مطابق زندگی گزارنے کا فیصلہ اگر پوری شان سے کر لیا جاتا ہے تو ایسا آدمی اسی نوید کا مستحق ہے۔

یہ روایت ہم نسلی مسلمانوں سے براہ راست متعلق نہیں ہے۔ ہمارے لیے یہ بشارت صرف اسی صورت میں ہے جب ہم خود ایمان کی حقیقت کو دریافت کریں اور پھر اپنے آپ کو اسوۂ پیغمبر میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہوئے موت سے ہم کنار ہوں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس روایت میں 'یعلم' کا لفظ آیا ہے۔ یہ لفظ اس ساری تفصیل کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ہمارے نزدیک روایت میں الفاظ کے بارے میں یہ یقینی نہیں ہوتا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی کہا ہو۔ جیسا کہ آپ متون کی بحث میں دیکھیں گے۔ 'یعلم' کی جگہ 'یشھد' کا لفظ بھی آیا ہے۔توحید کے ساتھ رسالت پر ایمان بھی بیان ہوا ہے۔قرآن مجید دوسری روایات اور اس مضمون کی روایات میں الفاظ کے فرق کو سامنے رکھیں تو یہی شرح موزوں ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

متون

یہ مضمون مختلف روایات میں اختلاف الفاظ کے ساتھ روایت ہوا ہے۔مثلاً حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

من کان آخر کلامه : لاإله إلا الله دخل الجنة. (ابوداؤد، رقم ۳۱۱۶)

''جس کی آخری بات لا الٰہ الا اللہ ہوگی، جنت میں جائے گا۔''

ایک دوسری روایت میں ہے:

من لقی الله لایشرك به شيئا دخل الجنة. (بخاری، رقم ۱۲۹)

''جو اللہ سے اس حال میں ملا کہ اس نے شرک نہیں کیا ہوگا، جنت میں جائے گا۔''

ایک روایت میں ہے:

ما من عبد يشهد أن لا إله إلا اللّٰه وأن محمد عبده ورسوله الا حرمه على النار. (مسلم، رقم ۳۲)

''اس بندہ پر لازماً آگ حرام کر دی جائے گی جو برملا اس بات کا اقرار کرے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔''

ابو ہریرہ سے روایت ہے:

أشهد أن لا إلـه إلا اللّٰه وأني رسول اللّٰـه، لا يلقى اللّٰه تعالىٰ بهما عبد غير شاك فيهما الا دخل الجنة. (مسلم، رقم ۲۷)

''جس نے گواہی دی کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور میں اس کا رسول ہوں، جو بندہ اللہ تعالیٰ سے ان کے ساتھ اس طرح ملے کہ اسے ان دونوں باتوں میں کوئی شک نہ ہو، وہ جنت میں جائے گا۔''

اسی طرح بخاری کی ایک روایت میں ان الفاظ میں یہ مضمون بیان ہوا ہے:

حرم اللّٰـه على النار من قال لا اله الا اللّٰه يبتغي بذلك وجه اللّٰه تعالىٰ. (رقم ۴۱۵)

''اللہ نے اس پر آگ حرام کر دی جس نے لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کیا اور اس سے اس کے پیش نظر خدا کی رضا تھی۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

بطور خاص یہ روایت دو اختلافات کے ساتھ مختلف کتب حدیث میں منقول ہے۔ ایک تو 'یعلم' کی جگہ 'یشهد' کا فعل ہے اور دوسرا یہ کہ توحید کے ساتھ رسالت کا بھی ذکر ہے۔

کتابیات

احمد، رقم ۴۶۴، ۴۹۸، ۲۲۰۵۶۔ ابن حبان، رقم ۲۰۱۔ سنن کبریٰ، رقم ۱۰۹۵۲، ۱۰۹۵۳، ۱۰۹۵۴، ۱۰۹۶۴۔

ساجد حمید

جمعہ کا وقت

[۱۴] وحدثنی عن مالك عن عمرو بن يحيى المازنی عن بن أبی سليط:

اَنَّ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ صَلَّى الْجُمُعَةَ بِالْمَدِيْنَةِ وَصَلَّى الْعَصَرَ بِمَلَلٍ.

قال مالك: وَذٰلِكَ لِلتَّهْجِيْرِ وَسُرْعَةِ السَّيْرِ.

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ابی سلیط سے روایت ہے کہ

''حضرت عثمان نے (ایک دفعہ) جمعہ مدینہ میں پڑھا، اور عصر جا کر ملل کے مقام پر پڑھی۔''

امام مالک کہتے ہیں:

''یہ اس وجہ سے ممکن ہوا کہ جمعہ ٹھیک دوپہر کے ہوتے ہی پڑھا گیا اور سفر تیز رفتاری سے کیا گیا۔''

شرح

مفہوم و مدعا

یہ روایت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے کسی سفر کے موقع سے متعلق ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ انھوں نے

اس سفر کے موقع پر جمعہ مدینہ میں ادا کیا اور ملل کے مقام پر جا کر عصر ادا کی۔ ملل کا فاصلہ مدینہ سے سترہ میل سے لے کر بائیس میل تک بتایا گیا ہے۔ کم از کم سفر بھی پیش نظر رکھیں تو جمعہ اور عصر کو ان کے معمول کے وقت پر ادا کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے یقیناً جمعہ بھی جلدی ادا کیا گیا اور عصر بھی کچھ مزید موخر ہوئی ہوگی۔

یہی وجہ ہے کہ امام مالک نے کہا ہے کہ یہ صرف اس وجہ سے ممکن ہوا کہ انھوں نے جمعہ دوپہر کے ہوتے ہی ادا کر لیا اور سفر بھی تیز کیا جس کی وجہ سے وہ عصر کے وقت پر ہی ملل کے مقام پر پہنچے۔

درایت

احادیث باب پر نظر

یہ روایت اپنے ان الفاظ کے ساتھ کہ ''حضرت عثمان نے (ایک دفعہ) جمعہ مدینہ میں پڑھا، اور عصر جا کر ملل کے مقام پر پڑھی'' موطا کی اس سے پہلی روایت کے خلاف ہے۔ یہ روایت اگر امام مالک والی تاویل نہ کی جائے تو یہ بات کہتی ہے کہ جمعہ شاید زوال سے پہلے ادا کر لیا گیا تھا۔ لیکن یہ بات درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ بات اسی وقت درست تھی جبکہ امام مالک والی بات عمل میں آنے میں بالکل ممکن نہ ہوتی۔

اگر عملاً یہ ممکن ہے کہ اونٹوں پر یا گھوڑوں پر سوار ہو کر سترہ سے بائیس میل کا فاصلہ طے ہو سکتا ہے تو یہی بہتر ہے کہ یہ مانا جائے، اس لیے کہ یہی عمل متواتر کے مطابق ہے۔

ہم یہ روایتیں پڑھ چکے ہیں کہ عصر کے بعد ایک آدمی دو یا تین فرسخ کا فاصلہ طے کر لیتا تھا اور ابھی سورج سفید روشن ہوتا تھا۔ ایک فرسخ تین میل کے برابر ہے۔ تو سترہ میل کا فاصلہ چھ فرسخ سے کم ہے۔ تو جتنا وقت عصر اور آفتاب کے زرد ہونے کے درمیان ہے، اس سے صرف دگنا وقت ہی لگے گا کہ ایک سوار سترہ میل کا فاصلہ طے کر لے۔ بائیس میل کا فاصلہ سات فرسخ اور ایک میل بنتا ہے، جس میں صرف ایک فرسخ ہی کا اضافہ ہوا ہے۔ اس لیے یہ بعید نہیں ہے کہ جمعہ اور عصر کے درمیانی وقفہ میں اتنا فاصلہ طے کر لیا جائے۔

روایت

یہ روایت ایک اثر ہے، جس میں خلیفۂ ثالث کے زمانے کا ایک واقعہ حکایت کیا گیا ہے۔ امام مالک اپنے تبصرہ

کے ساتھ اسے اس لیے لائے ہیں کہ اس سے شاید ان کے زمانے میں یہ استدلال کیا جا رہا ہوگا، یا وہ سمجھتے ہوں گے کہ اس سے یہ استدلال کیا جا سکتا ہے کہ جمعہ زوال سے پہلے پڑھا جاتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے 'تہجیر' کا لفظ بول کر بتا دیا کہ جمعہ 'الضحاء' (چاشت) کے وقت نہیں، دوپہر کے وقت پڑھا گیا۔ جس سے معلوم ہوا کہ امام مالک اصل میں اسی مسلک کے قائل تھے کہ جمعہ اور ظہر کا وقت ایک ہی ہے۔

اس باب پر ایک نظر

جمعہ کا وقت وہی ہے، جو ظہر کا ہے۔ لیکن اس میں ظہر کی طرح گرمیوں میں زیادہ تاخیر نہیں کی جاتی تھی۔ بلکہ اسے ہر موسم میں جلدی ادا کیا جاتا تھا۔ لیکن یہ بات واضح ہے کہ جمعہ کا وقت زوال کے بعد ہی تھا۔

اس باب میں امام مالک رحمہ اللہ نے اسی بات کو ثابت کیا ہے۔ چنانچہ پہلی روایت وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عمل کی لائے ہیں۔ جس سے صاف واضح ہے کہ وہ جمعہ زوال کے بعد ایک بوریا تک سایے کے لمبا ہونے پر پڑھتے۔ اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے جس واقعہ کو غلط پیش کیا جا سکتا تھا، اس کی انھوں نے توجیہہ کر دی ہے۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

جاوید احمد غامدی

اخلاقیات

(۸)

(گزشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

عفت و عصمت

چوتھا حکم یہ ہے کہ کوئی شخص زنا کے قریب نہ جائے۔ اس کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ یہ کھلی بے حیائی اور نہایت برا طریقہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے برائی اور بے حیائی ہونے پر کسی دلیل و حجت کی ضرورت نہیں ہے۔ انسان کی فطرت اسے ہمیشہ سے ایک بڑا گناہ اور ایک سنگین جرم سمجھتی رہی ہے اور جب تک وہ بالکل مسخ نہ ہو جائے، اسی طرح سمجھتی رہے گی۔ انسان سے متعلق یہ حقیقت بالکل ناقابل تردید ہے کہ خاندان کا ادارہ اس کے لیے ہوا اور پانی کی طرح ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ یہ ادارہ صحیح فطری جذبات کے ساتھ صرف اسی صورت میں قائم ہوتا اور قائم رہ سکتا ہے، جب زوجین کا باہمی تعلق مستقل رفاقت کا ہو۔ یہ چیز اگر مفقود ہو جائے تو اس سے فطری اور روحانی جذبات سے محروم جانوروں کا ایک گلہ تو وجود میں آ سکتا ہے، کوئی صالح معاشرہ اور صالح تمدن وجود پزیر نہیں ہو سکتا۔ صاحب ''تفہیم القرآن'' سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

> ''اس فعل کا اخلاقاً برا ہونا، یا مذہباً گناہ ہونا، یا معاشرتی حیثیت سے معیوب اور قابل اعتراض ہونا، ایک ایسی چیز ہے جس پر قدیم ترین زمانے سے آج تک تمام انسانی معاشرے متفق رہے ہیں، اور اس میں بجز ان متفرق لوگوں کے جنھوں نے اپنی عقل کو اپنی نفس پرستی کے تابع کر دیا ہے، یا جنھوں نے خبطی پن کی اپچ کو فلسفہ طرازی سمجھ رکھا

ہے، کسی نے آج تک اختلاف نہیں کیا ہے۔ اس عالمگیر اتفاق رائے کی وجہ یہ ہے کہ انسانی فطرت خود زنا کی حرمت کا تقاضا کرتی ہے۔ نوع انسانی کا بقا اور انسانی تمدن کا قیام، دونوں اس بات پر منحصر ہیں کہ عورت اور مرد محض لطف اور لذت کے لیے ملنے اور پھر الگ ہو جانے میں آزاد نہ ہوں، بلکہ ہر جوڑے کا باہمی تعلق ایک ایسے مستقل اور پائدار عہد وفا پر استوار ہو جو معاشرے میں معلوم و معروف بھی ہو اور جسے معاشرے کی ضمانت بھی حاصل ہو۔ اس کے بغیر انسانی نسل ایک دن کے لیے بھی نہیں چل سکتی، کیونکہ انسان کا بچہ اپنی زندگی اور اپنے انسانی نشوونما کے لیے کئی برس کی دردمندانہ نگہداشت اور تربیت کا محتاج ہوتا ہے، اور تنہا عورت اس بار کو اٹھانے کے لیے کبھی تیار نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ مرد اس کا ساتھ نہ دے جو اس بچے کے وجود میں آنے کا سبب بنا ہو۔ اسی طرح اس معاہدے کے بغیر انسانی تمدن بھی برقرار نہیں رہ سکتا، کیونکہ تمدن کی تو پیدایش ہی ایک مرد اور ایک عورت کے مل کر رہنے، ایک گھر اور ایک خاندان وجود میں لانے، اور پھر خاندانوں کے درمیان رشتے اور رابطے پیدا ہونے سے ہوئی ہے۔ اگر عورت اور مرد گھر اور خاندان کی تخلیق سے قطع نظر کر کے محض لطف و لذت کے لیے آزادانہ ملنے لگیں تو سارے انسان بکھر کر رہ جائیں، اجتماعی زندگی کی جڑ کٹ جائے، اور وہ بنیاد ہی باقی نہ رہے جس پر تہذیب و تمدن کی یہ عمارت اٹھی ہے۔ ان وجوہ سے عورت اور مرد کا ایسا آزادانہ تعلق جو کسی معلوم و معروف اور مسلم عہد وفا پر مبنی نہ ہو، انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ انھی وجوہ سے انسان اس کو ہر زمانے میں ایک سخت عیب، ایک بڑی بداخلاقی، اور مذہبی اصطلاح میں ایک شدید گناہ سمجھتا رہا ہے۔'' (تفہیم القرآن ۲/ ۳۲۰)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اس فعل کی یہی شناعت ہے جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے صرف اتنی بات نہیں کہی کہ زنا نہ کرو، بلکہ فرمایا ہے کہ زنا کے قریب بھی نہ جاؤ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایسی تمام باتوں سے دور رہو جو زنا کی محرک، اس کی ترغیب دینے والی اور اس کے قریب لے جانے والی ہیں۔ سورۂ نور میں مرد و زن کے اختلاط کے جو آداب بیان ہوئے ہیں، وہ انسان کو اسی طرح کی چیزوں سے بچانے کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے کہ مرد و عورت، دونوں اپنے جسمانی اور نفسیاتی تقاضوں کے لحاظ سے اپنی نگاہوں کو زیادہ سے زیادہ بچا کر اور اپنے جسم میں اندیشے کی جگہوں کو زیادہ سے زیادہ ڈھانپ کر رکھیں اور کوئی ایسی بات نہ کریں جو ایک دوسرے کے صنفی جذبات کو برانگیختہ کرنے والی ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شیطان جب کسی معاشرے میں زنا کو عام کرنا چاہتا ہے تو وہ اپنی تاخت کی ابتدا بالعموم انھی چیزوں سے کرتا ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم و حوا پر بھی وہ اسی راستے سے حملہ آور ہوا تھا۔ چنانچہ فرمایا ہے:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ ''آدم کے بیٹو، ایسا نہ ہو کہ شیطان تمھیں پھر اسی طرح

اَخْرَجَ اَبَوَیْکُمْ مِّنَ الْجَنَّۃِ، یَنْزِعُ عَنْھُمَا لِبَاسَھُمَا لِیُرِیَھُمَا سَوْاٰتِھِمَا، اِنَّہٗ یَرٰئکُمْ ھُوَ وَقَبِیْلُہٗ ، مِنْ حَیْثُ لَا تَرَوْنَھُمْ، اِنَّا جَعَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ اَوْلِیَآءَ لِلَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ. (الاعراف ۷:۲۷)

فتنے میں مبتلا کر دے، جس طرح اُس نے تمھارے والدین کو اُن کے لباس اتروا کر کہ اُن کی شرم گاہیں اُن کے سامنے کھول دیں، اُس باغ سے نکلوا دیا تھا (جس میں وہ رہ رہے تھے)۔وہ اور اس کے ساتھی تمھیں وہاں سے دیکھتے ہیں، جہاں سے تم اُنھیں نہیں دیکھ سکتے۔اس طرح کے شیطانوں کو (البتہ)، ہم نے اُنھی لوگوں کا ساتھی بنایا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔''

یہ حملہ کس طرح ہوتا ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...وہ اپنی وسوسہ اندازیوں سے پہلے لوگوں کو اس لباس تقویٰ وخشیت سے محروم کرتا ہے جو اللہ نے بنی آدم کے لیے اس ظاہری لباس کے ساتھ ایک تشریف باطنی کی حیثیت سے اتارا ہے...جب یہ باطنی جامہ اتر جاتا ہے تو وہ حیا ختم ہو جاتی ہے جو اس ظاہری لباس کی اصل محرک ہے۔ پھر یہ ظاہری لباس ایک بوجھ معلوم ہونے لگتا ہے۔ بے حیائی صنفی اعضا میں، جن کا چھپانا تقاضاے فطرت ہے، عریاں ہونے کے لیے تڑپ پیدا کرتی ہے، پھر فیشن اس کو سہارا دیتا ہے اور وہ لباس کی تراش خراش میں نت نئی اختراعات سے ایسے ایسے اسلوب پیدا کرتا ہے کہ آدم کے بیٹے اور حوا کی بیٹیاں کپڑے پہن کر بھی لباس کے بنیادی مقصد، یعنی ستر پوشی کے اعتبار سے گویا ننگے ہی رہتے ہیں۔ پھر لباس میں صرف زینت اور آرایش کا پہلو باقی رہ جاتا ہے اور اس میں بھی اصل مدعا یہ ہوتا ہے کہ بے حیائی زیادہ سے زیادہ دل کش زاویہ سے نمایاں ہو۔ پھر آہستہ آہستہ عقل اس طرح ماؤف ہو جاتی ہے کہ عریانی تہذیب کا نام پاتی ہے اور ساتر لباس وحشت و دقیانوسیت کا۔ پھر پڑھے لکھے شیاطین اٹھتے ہیں اور تاریخ کی روشنی میں یہ فلسفہ پیدا کرتے ہیں کہ انسان کی اصل فطرت تو عریانی ہی ہے، لباس تو اس نے رسوم ورواج کی پابندیوں کے تحت اختیار کیا ہے۔ یہ مرحلہ ہے جب دیدوں کا پانی مر جاتا ہے اور پورا تمدن شہوانیت کے زہر سے مسموم ہو جاتا ہے۔''

(تدبر قرآن ۳/۲۴۶)

اللہ تعالیٰ نے زنا کا چرچا کرنے اور اس کے لیے ترغیبات پیدا کرنے کی کوشش کو اسی بنا پر ایک بڑا جرم قرار دیا ہے۔ قرآن کا بیان ہے کہ مدینہ میں جب منافقین و اشرار نے اس طرح کی کوششیں شروع کیں تو ارشاد ہوا:

اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَۃُ فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا، لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ فِی الدُّنْیَا

''بے شک، جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں بدکاری پھیلے، اُن کے لیے دنیا اور آخرت، دونوں

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

وَالْاٰخِرَةِ، وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ. (النور۲۴: ۱۹)

میں دردناک عذاب ہے۔ (وہ اِسی کے سزاوار ہیں) اور اللہ (اُنھیں) جانتا ہے، لیکن تم نہیں جانتے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی مقصد سے عورتوں کے تیز خوشبو لگا کر باہر نکلنے، مردوں کے پاس تنہا بیٹھنے، یا ان کے ساتھ تنہا سفر کرنے سے منع فرمایا۔[۵۳] لوگوں نے دیور کے بارے میں پوچھا تو ارشاد ہوا کہ اس کے ساتھ تنہائی میں بیٹھنا موت کو دعوت دینا ہے۔[۵۴] لمبے سفر میں محرم رشتے داروں کو ساتھ لے جانے کی ہدایت کا مقصد بھی یہی ہے۔[۵۵] پہلی کے بعد دوسری نظر کو فوراً پھیر لینے کے لیے بھی اسی لیے کہا ہے۔[۵۶] غنا اور موسیقی کی بعض صورتوں کے بارے میں بھی اسی لیے متنبہ فرمایا ہے کہ وہ اس کی محرک ہو سکتی ہیں۔[۵۷] آپ کا ارشاد ہے کہ آدم کے بیٹے زنا میں سے کچھ نہ کچھ حصہ لازماً پا لیتے ہیں۔ چنانچہ دیدہ بازی آنکھوں کی زنا ہے، لگاوٹ کی بات چیت زبان کی زنا ہے، اس طرح کی باتوں سے لذت لینا کانوں کی زنا ہے، ہاتھ لگانا اور اس کے لیے چلنا ہاتھ پاؤں کی زنا ہے۔ پھر دل و دماغ خواہش کرتے ہیں اور شرم گاہ کبھی اس کی تصدیق کرتی ہے اور کبھی جھٹلا دیتی ہے۔[۵۸]

یہ سد ذریعہ کی ہدایات ہیں اور اسی لیے دی گئی ہیں کہ زنا کو وہاں سے روک دیا جائے، جہاں سے اس کے لیے سفر کی ابتدا ہوتی ہے۔

[باقی]

۵۳؎ بخاری، رقم ۱۰۳۸۔

۵۴؎ بخاری، رقم ۴۹۳۴۔ مسلم، رقم ۲۱۷۲۔

۵۵؎ بخاری، رقم ۱۰۳۶۔ مسلم، رقم ۱۰۴۰۔

۵۶؎ ابوداؤد، رقم ۲۱۴۸۔

۵۷؎ بخاری، رقم ۵۲۶۸۔

۵۸؎ بخاری، رقم ۵۸۸۹۔ مسلم، رقم ۲۶۵۷۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

پروفیسر خورشید عالم

چہرے کا پردہ

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ چنانچہ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

حسب ذیل مضمون معروف اسکالر جناب پروفیسر خورشید عالم صاحب کی تالیف ہے۔ اس میں انھوں نے عورت کے حجاب کے حوالے سے اپنا نقطۂ نظر بالتفصیل بیان کیا ہے۔ اس ضمن میں مدیر ''اشراق'' جناب جاوید احمد صاحب غامدی کا موقف ان کی تالیف ''قانون معاشرت'' میں ''مرد و زن کا اختلاط'' کے زیر عنوان شائع ہو چکا ہے۔ نائب مدیر]

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

خالق کائنات نے آدم اور حوا، دونوں کو جنت کا مکین بنایا۔ دونوں کو حکم دیا کہ اللہ کی اطاعت کریں۔ لیکن دونوں کو ابلیس نے حیات جاوداں کا فریب دے کر اس درخت کا پھل کھانے پر آمادہ کیا جس سے اللہ نے ان دونوں کو منع فرمایا تھا۔ نافرمانی کی پاداش میں دونوں کے مخصوص اعضا ایک دوسرے کے سامنے برہنہ ہو گئے۔ طبعی مزاج کے باعث وہ اپنے اعضا پر جنت کے پتے جوڑ جوڑ کر رکھنے لگے۔ اللہ نے ان کے لیے زمین پر ٹھکانا بنایا اور انھیں زمین پر اترنے کا حکم دیا اور ان کو زندگی گزارنے کے لیے ہر وہ چیز مہیا کی جس کی ان کو ضرورت تھی۔ سب سے پہلے ان کو لباس کی نعمت سے نوازا، کیونکہ عریانی انسان کی توہین اور رسوائی کا باعث ہے اور ستر پوشی انسان کی عزت و تکریم کا سبب۔ یہ لباس تین قسم کا تھا: ستر پوشی کا لباس، زینت کا لباس اور تقویٰ کا لباس۔ پہلے دو لباس بدن کے عیوب کو چھپاتے ہیں اور تیسرا لباس دل کے عیوب کو دور کرتا ہے۔ تقویٰ کیا ہے؟ برائی سے رکتے اور بھلائی کو کرتے وقت اللہ کے خوف کا احساس، یعنی اللہ انسان کے اندر ایک ایسی پاکیزگی پیدا کرنا چاہتا ہے جو انسان کے ایمان اور وجدان سے پیدا ہوتی ہے، نہ کہ قانون کے زور سے۔ دونوں ظاہری لباس باطنی لباس کے بغیر کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ اگر دلوں میں تقویٰ نہ ہو تو سات یا آٹھ میٹر کا کپڑا مرد و زن کو ایک دوسرے کی ذہنی خباثت سے کیسے محفوظ رکھ سکتا ہے؟

آدم کو خلافت کی جو ذمہ داریاں سونپی گئیں، ان کو آدم اور حوا نے مل جل کر پورا کرنا تھا۔ زندگی کی اس تگ و دو میں دونوں برابر کے شریک ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں، وہ اچھے کام کرنے کو کہتے ہیں اور برے کاموں سے روکتے ہیں۔ اور نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔'' (التوبہ ۹:۷۱)

آدم و حوا، مرد اور عورت، دونوں ایک دوسرے کے زوج ہیں۔ دونوں مل جل کر معاشرے کی تشکیل کرتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے بغیر ناقص ہیں۔ دونوں یکساں واجب التعظیم ہیں۔ دونوں کو دل و دماغ کی یکساں صلاحیتیں عطا کی گئی ہیں۔ دونوں احکام الٰہی کے مکلّف ہیں اور دونوں کے اعمال کی جزا اور سزا برابر ہے۔

اگر قدرت کا منشا یہ ہوتا کہ عورت کو چھپا کر مرد سے علیحدہ رکھا جائے تاکہ عورت اس کی عطا کردہ صلاحیتوں کا محدود استعمال کرے تو قدرت عورت کی ان صلاحیتوں کو مختلف ساخت دے دیتی، مگر قدرت نے عورت کو مرد کی طرح سننے، دیکھنے اور سوچنے کی صلاحیتیں دی ہیں تاکہ وہ مرد کے ساتھ مل کر بھرپور فعال کردار ادا کرے اور تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے۔ چنانچہ عورت کو سوسائٹی سے کاٹ کر گھر میں بند رکھنا منشاے الٰہی کے خلاف ہے۔ عہد نبوت اور خلفاے راشدہ کے دور میں بھی عورتیں اپنے خانگی کاموں یا دینی و تمدنی ضروریات کے لیے گھروں سے باہر نکلتی تھیں، وہ مردوں سے چھپ کر زندگی بسر نہیں کرتی تھیں، بلکہ دینی اور ثقافتی تقریبات میں شرکت کرتی تھیں، وعظ و نصیحت کی مجالس میں اور پنج وقتہ نماز میں شرکت کے لیے مسجد نبوی میں جایا کرتی تھیں، لیکن باہر نکلتے وقت ان کے لباس اور رفتار و گفتار میں بے حیائی کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔

دور ملوکیت میں روم اور ایران کی شہنشاہیت کے زیر اثر عورتوں کو مردوں سے علیحدہ کر دیا گیا۔ پردہ نشینی عرب سماج میں مروج ہوگئی اور حرم کا نظام عمل میں آ گیا۔ عورتوں کو سختی کے ساتھ گھروں میں بند رکھنے کی رسم کا اسلام میں قطعی کوئی وجود نہیں، بلکہ قرآن نے عورتوں کو گھروں میں بند رکھنے کو بطور سزا تسلیم کیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

''جو عورتیں تمھاری بیویوں میں سے بے حیائی کا کام کریں تو تم ان عورتوں پر چار آدمی اپنے میں سے گواہ کر لو، پس اگر وہ گواہی دیں تو تم ان کو گھروں میں بند رکھو، یہاں تک کہ موت ان کا خاتمہ کر دے یا اللہ تعالیٰ ان کے لیے کوئی اور راہ تجویز فرمائیں۔'' (النساء ۴:۱۵)

پردے کے جتنے احکام قرآن میں موجود ہیں، ان کا مقصد بھی یہی ہے کہ عورت کو چھپا کر نہ رکھا جائے، بلکہ باہر نکلتے وقت لباس میں احتیاط کی جائے۔ اگر خواتین کو چھپا کر پابند رکھنا مقصود ہوتا تو پردے کے احکام کی کیا ضرورت تھی، کیونکہ گھر تو بذات خود ایک پردہ ہے۔ اسلام میں عورت کا پردہ یہ ہے کہ وہ مردوں کے ساتھ میل جول کے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

دوران میں اپنے بدن کو ڈھانپے اور اس کی نمایش نہ کرے۔

مرد اور عورت، دونوں کو نظریں نیچی کرنے کا حکم دیا گیا ہے، بلکہ مردوں کو پہلے حکم دیا گیا ہے، مگر عجیب بات ہے کہ مردوں کو جو حکم ہوا، اس کا چرچا نہیں ہوتا۔ طبرانی نے حضرت جابر سے روایت کی ہے:

عفوا تعف نساء کم و بروا آباء کم تبر أبناء کم.

''پاک باز ہو جاؤ، تمھاری عورتیں خود بخود پاک باز ہو جائیں گی۔ اپنے ماں باپ کے فرماں بردار ہو جاؤ، تمھاری اولاد خود بخود تمھاری فرماں بردار ہو جائے گی۔''

آپ نے دیکھا کہ اخلاقی حدود نیک مرد متعین کرتے ہیں۔ چند بدنیت مردوں کی موجودگی کی وجہ سے عورت نارمل اور بھرپور زندگی بسر کرنے کے حق سے محروم ہو جاتی ہے۔ منہ چھپانے والی عورت دراصل اخلاقی لحاظ سے مرد کو ایک کمزور اور ناقابل اعتبار مخلوق قرار دے رہی ہوتی ہے۔

موضوع پر گفتگو کرنے سے پہلے دو باتوں کا ذکر بطور خاص کرنا چاہتا ہوں، کیونکہ ان کے بغیر موضوع کے بارے میں ذہن صاف نہیں ہوگا۔ پہلی بات یہ ہے کہ سورۂ احزاب سورۂ نور سے پہلے نازل ہوئی، کیونکہ اس سورت میں غزوۂ خندق اور بنوقریظہ کی فتح کا ذکر ہے اور یہ واقعات ذی قعدہ کے آخر میں ۴ ھ میں رونما ہوئے، جبکہ سورۂ نور واقعۂ افک اور غزوۂ بنی مصطلق کے بعد نازل ہوئی اور یہ واقعات شعبان ۶ ھ میں ہوئے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی ''فتح الباری'' میں فرماتے ہیں:

''مشہور قول یہی ہے کہ سورۂ احزاب ۴ ھ میں نازل ہوئی اور اس کی دلیل عبداللہ بن عمر کی وہ روایت ہے جسے بخاری نے (کتاب الشہادات اور کتاب المغازی) اور مسلم نے (کتاب الامارۃ میں) پیش کیا ہے کہ انھوں نے جنگ احد کے موقع پر جبکہ ان کی عمر چودہ برس تھی، اپنے آپ کو جہاد کے لیے پیش کیا، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت نہ دی۔ پھر انھوں نے اپنی خدمات غزوۂ خندق کے موقع پر پیش کیں، جبکہ وہ پندرہ برس کے تھے تو آپ نے اجازت دے دی۔'' (۷: ۴۰۷، ۴۰۸)

مسلم کے شارح امام نووی کہتے ہیں کہ یہ روایت بتاتی ہے کہ غزوۂ خندق ۴ ھ میں ہوا اور یہ صحیح ہے، کیونکہ غزوۂ احد بلاشک ۳ ھ میں ہوا۔ مالک بن انس، موسیٰ بن عقبہ، امام بخاری، ابن قتیبہ، یعقوب بن سفیان، امام نووی، امام ابن حزم اور ابن خلدون نے اسی رائے کی تائید کی ہے۔ طبرانی نے ابن اسحاق کی سند سے روایت کی ہے کہ ''غزوۂ بنی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مصطلق ۶ ھ میں ہوا[1]۔'' ھیثمی کا قول ہے کہ اس روایت کے راوی ثقہ ہیں۔ ابن جریر طبری، ابن حزم، ابن العربی، ابن اثیر اور ابن خلدون کی بھی یہی رائے ہے۔ امام سیوطی نے بھی اتقان میں سورۂ احزاب کو سورۂ نور سے مقدم تسلیم کیا ہے[2]۔

دوسری بات یہ ہے کہ لفظ حجاب اور ستر میں کیا فرق ہے؟ اس کی وضاحت ضروری ہے۔ امام راغب حجاب کے معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کسی چیز تک پہنچنے سے روکنا اور درمیان میں حائل ہونا، جیسے وہ پردہ جو دل اور پیٹ کے درمیان حائل ہے، اسے حجاب الجوف (Diaphragm) کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے کہ جنت اور دوزخ کے درمیان حجاب ہوگا[3]۔ اس سے مراد وہ آڑ ہے جو جنت کی لذتوں کو جہنم تک پہنچنے سے روک دے گی۔ حاجب دربان کو کہتے ہیں کیونکہ وہ بادشاہ تک پہنچنے سے روکتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے: 'کلا انھم عن ربھم یومئذ لمحجوبون[4]' اس کے معنی یہ ہیں کہ قیامت کے روز تجلی الٰہی سے ان کو روک لیا جائے گا۔ ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں حجاب کے عنوان سے ایک باب باندھا ہے جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ حکومتیں اپنی تشکیل کے ابتدائی ایام میں اپنے اور عوام کے درمیان کوئی حجاب یا فاصلہ نہیں رکھتیں۔ اس طرح اردو میں حجاب کے معنی رکاوٹ، آڑ اور اوٹ کے بنتے ہیں۔ ان معنوں میں لباس اور پہناوے کا مفہوم قطعی شامل نہیں۔ عورت کے پردے کے بارے میں حجاب کا استعمال ایک نئی اصطلاح ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی پردے کو دوسری اقوام کے پردوں پر قیاس کیا گیا ہے۔ زمانۂ قدیم اور خاص طور پر فقہا کی اصطلاح میں ستر پردے کے معنوں میں آتا ہے۔ کتاب الصلاۃ ہو یا کتاب النکاح، فقہا نے ہر جگہ پہناوے کے مفہوم میں لفظ حجاب کو نہیں، بلکہ ستر کو استعمال کیا ہے۔ فقہا نے کبھی بھی آیت حجاب کو ستر کے حق میں پیش نہیں کیا۔ آج کل حجاب کو صرف سکارف کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ فرانس، ترکی یا جہاں خواتین حجاب کے حق میں مظاہرہ کرتی ہیں، وہاں اس سے مراد Head Scarf (سرپوش) ہوتا ہے۔

میں صرف ان آیات مبارکہ کا ذکر کروں گا جن میں یا تو پردے کے حدود متعین ہیں یا انھیں چہرے کے پردے

---

[1] مجمع الزوائد ۶:۱۴۲۔

[2] ۱:۸۲۔

[3] ۵:۴۶۔

[4] ۸۳:۱۵۔

کے بارے میں بطور دلیل استعمال کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے سورۂ احزاب کی آیات کو پیش کروں گا کیونکہ وہ سورۂ نور سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اے ایمان والو، نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گھروں میں (یونہی) مت داخل ہوا کرو سوائے اس کے کہ تمھیں کھانے کے لیے اجازت دی جائے، مگر اس کے پکنے کے منتظر نہ رہو، بلکہ جب تمھیں بلایا جائے (کہ کھانا تیار ہے) تب داخل ہوا کرو پھر جب تم کھانا کھا لو تو اٹھ کر چلے جایا کرو اور باتوں میں جی لگا کر مت بیٹھے رہا کرو۔ یہ بات نبی کو تکلیف دیتی ہے، وہ تم سے حیا کرتے ہیں۔ اللہ حق بات کہنے سے شرم نہیں کرتا۔ اور جب تم ان (امہات المومنین) سے کوئی متاع (سامان) مانگو تو اوٹ کے پیچھے سے مانگا کرو، یہ بات تمھارے دلوں کے لیے اور ان کے دلوں کے لیے پاک رہنے کا عمدہ ذریعہ ہے اور تمھیں مناسب نہیں کہ اللہ کے رسول کو ایذا دو اور نہ یہ کہ اس کی بیویوں سے اس کے بعد نکاح کرو اور یہ بات اللہ کے نزدیک بہت بری ہے۔'' (۳۳:۵۳)

پس منظر

منافقین کا گروہ مدینے میں اسلامی معاشرے کے خلاف نت نئی سازشوں میں مصروف تھا اور وہ شب و روز اس ٹوہ میں رہتے تھے کہ اہل بیت کے بارے میں کوئی اسکینڈل بنائیں تاکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف ہو اور مسلمانوں کی ساکھ کو نقصان پہنچے۔ بقول مولانا امین احسن اصلاحی وہ درانہ نبی کریم کے گھروں میں گھس جاتے تھے تاکہ وسوسہ اندازی کا کوئی موقع ان کے ہاتھ لگے۔ یہ حالات تھے جب مسلمانوں کو امہات المومنین سے تخاطب اور گھروں کے اندر جانے کے آداب کی تعلیم دی گئی اور امہات المومنین کو اپنا رویہ بدلنے کا حکم ہوا تاکہ غرض مندان کی کسی لغزش کو حجت نہ بنا سکیں۔ منافق عورتیں ازواج مطہرات کے دلوں میں اس قسم کے ارمان پیدا کرنے کی کوشش کرتی تھیں کہ آپ تقشّف کی اس زندگی سے چھٹکارہ حاصل کر لیں تو وقت کے سردار آپ کو نکاح کا پیغام دیں گے۔ امہات المومنین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب نان و نفقہ میں اضافے کا مطالبہ کیا، وہ بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی تھی۔ سورۂ احزاب کی آیات نمبر ۲۸ تا ۳۴ میں مخاطب امہات المومنین ہیں، ان آیات کی ابتدا اور انتہا، ان کا انداز بیان اور افعال وضمائر کا استعمال، سب اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ منافقوں کی سازشوں کے پیش نظر امہات المومنین کو خاص خاص باتوں کی تعلیم دی گئی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

شان نزول

آیت نمبر۵۳ کی شان نزول بھی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ یہ آیت امہات المومنین کے لیے مخصوص ہے۔ ابن العربی احکام القرآن میں کہتے ہیں کہ اس آیت کی شان نزول کے سلسلہ میں صحیح روایات حضرت انس سے مروی ہیں[۵]۔ حضرت انس کی روایت کو بخاری، مسلم اور ترمذی نے نقل کیا ہے۔ حضرت انس کہتے ہیں کہ میں اس حدیث کو سب سے بہتر جانتا ہوں:

''جب سیدہ زینب بنت جحش نکاح کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر آئیں تو آپ نے دعوت ولیمہ کا اہتمام کیا۔ ستو اور گھی کا آمیزہ بنایا اور ایک بکری ذبح کی ۔ میری والدہ ام سلیم نے پتھر کے ایک برتن میں حیس (کھجور، ستو اور گھی کا آمیزہ) بھیجا، لوگوں کو دعوت دی گئی ۔ کوئی تین سو کے قریب مہمان تھے۔ ایک ٹولی آتی تھی کھانا کھا کر نکل جاتی تھی یہاں تک کہ سب لوگوں نے کھانا کھا لیا۔ آپ نے دسترخوان اٹھانے کا حکم دیا۔ صرف تین مہمان بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اس دوران میں سیدہ زینب دیوار کی طرف منہ کر کے بیٹھیں رہیں۔ آپ باہر نکل گئے ۔ لوٹ کر آئے تو وہ تین آدمی ابھی تک بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ جب انھیں محسوس ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کا وجود گراں گزر رہا ہے تو وہ بھی اٹھ کر چلے گئے۔ آپ نے پردہ گرا لیا اور اندر داخل ہوئے جبکہ میں حجرے میں بیٹھا ہوا تھا... پھر اس آیت کا نزول ہوا اللہ کے رسول باہر نکلے اور یہ آیت پڑھ کر سنائی۔''

امام رازی تفسیر کبیر میں کہتے ہیں کہ جب لوگوں کو رسالت مآب کے گھروں میں داخل ہونے سے روک دیا گیا تو ماعون (برتنے کی چیزیں) کے حصول میں دقت ہوتی تھی حالانکہ ان کا مانگنا ممنوع نہیں۔ تو حکم ہوا کہ گھر میں نہ گھسا کرو، بلکہ اوٹ کے پیچھے سے مانگ لیا کرو[۶]۔

بے پروا عرب مسلمان کسی بات کا خیال کیے بغیر بے دھڑک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں گھس جایا کرتے تھے، جہاں آپ کی ازواج مطہرات تشریف رکھتی تھیں۔ منافق تو اسکینڈل بنانے کے موقع کی تلاش میں رہتے تھے تو یہ آیت نازل ہوئی کہ اولاً تو بلا اطلاع اور بلا اجازت پیغمبر کے گھر میں داخل ہونے کی کوشش ہی نہ کرو اور اگر تمھیں دعوت میں بلایا جائے تو ان آداب کو پیش نظر رکھو جو آیت میں مذکور ہیں کیونکہ ان آداب کو نظر انداز کرنے سے پیغمبر کو تکلیف ہوتی ہے۔ اور پھر جب تم ازواج مطہرات سے کچھ مانگنا چاہو تو تمھیں چاہیے کہ گھر میں

۵؎ ۳:۱۵۷۳۔

۶؎ ۲۴:۲۲۵

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

داخل ہوئے بغیر اوٹ کے پیچھے سے طلب کرو۔ یہ طریقہ تمھارے اوران کی پاکیزگی کے لیے بہتر ہے۔

یہ آیت مبارکہ بلند و بالا آداب پر مشتمل ہے۔ گھر میں داخل ہونے کے آداب، ازواج مطہرات سے مخاطب ہونے کے آداب اور یہ ادب کہ بلاضرورت بات نہ کی جائے۔

آیت میں مذکور دستور اس طرز عمل سے متعلق ہے جو انسان کو دوسروں کے گھروں کے لیے اختیار کرنا چاہیے۔اس کے مطابق مرد کے لیے جائز نہیں کہ وہ عورتوں کی رہایش میں داخل ہو۔ اگر اسے کسی چیز کی ضرورت ہے تو اسے چاہیے کہ پس دیوار کھڑے ہو کر اسے طلب کرے۔ اس بات کا پردے کی بحث سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ پردہ کو فقہ میں ستر کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے، نہ کہ حجاب کے نام سے۔ کسی فقیہ نے پردے کے لیے آیت حجاب سے دلیل نہیں پکڑی۔ اصل مقصد یہ ہے کہ مرد اور عورت تنہائی میں اکٹھے نہ ہوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''کوئی مرد کسی عورت سے خلوت نہ کرے وگرنہ دونوں کے ساتھ تیسرا شیطان ہوگا۔'' عورت مرد سے تنہائی میں نہیں مل سکتی نہ چہرہ ننگا کر کے اور نہ چہرے پر کپڑا ڈال کر۔ آیت کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی اندر چلا جائے اور وہ چہرہ ڈھانپ کر اس کے سامنے بیٹھ جائے۔ حجاب سے یہاں مراد پہناوا یا لباس نہیں، بلکہ مراد دروازے، دیوار یا کسی اور چیز کی اوٹ ہے۔

ایک اچھے معاشرے کا بنیادی اصول یہ ہے کہ عورت کا احترام کیا جائے۔ اس اعتبار سے ازواج مطہرات خاص احترام کی سزاوار ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام و مرتبہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے حکم دیا گیا کہ کوئی ایسی حرکت نہ کی جائے جس سے ان کو جیتے جی یا وفات کے بعد تکلیف ہو۔ اسی احترام کے پیش نظر آپ کی ازواج کو آپ کی وفات کے بعد شادی کی اجازت نہیں دی گئی۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اہل تحقیق کا ان آیات کے بارے میں ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ ان آیات میں ازواج مطہرات کو خاص طور پر مخاطب کیا گیا ہے۔ ان آیات میں امہات المومنین کے امتیازی حقوق کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ ان امتیازات میں سے ایک تو یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ان سے نکاح حرام ہے۔ دوسرے ان کی جزا و سزا دگنی ہے۔ تیسرے ان کو طلاق دے کر دوسری عورت سے شادی کرنا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حرام قرار دیا گیا ہے۔ چوتھے ان کے گھروں میں آیات کا نزول ہوتا ہے چنانچہ 'قرن فی بیوتکن' اور آیت حجاب بھی انھی امتیازات میں سے ہے۔ آیات کا آغاز یوں کیا گیا ہے: ''اے نبی کی بیویو، تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو' اور اختتام اس طرح ہوا ہے: ''اے نبی کے اہل بیت، تمھیں اللہ آلودگی سے پاک کرنا چاہتا ہے۔'' اللہ نے تطہیر کا ذمہ صرف ازواج مطہرات کے لیے کیا ہے، نہ کہ عام عورتوں کے لیے۔

سنن ابی داؤد (جلد سوم کتاب اللباس) میں ام سلمہ سے مروی ہے:

''میں اور میمونہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھیں کہ عبداللہ بن ام مکتوم آ گئے۔ آپ نے فرمایا: اس سے پردہ کرو۔ ہم نے کہا: وہ تو اندھا ہے۔ آپ نے فرمایا: تم تو اندھی نہیں۔ کیا تم اسے نہیں دیکھ رہی ہو۔''

امام ابوداؤد کا قول ہے کہ یہ حکم نبی کریم کی بیویوں کے ساتھ خاص ہے۔ ابن قدامہ حنبلی المغنی (۷: ۴۶۶) میں کہتے ہیں کہ اثرم کہتے ہیں کہ میں نے ابوعبداللہ (امام احمد بن حنبل) سے پوچھا کہ کیا نبہان والی روایت (جو ام سلمہ سے مروی ہے) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کے بارے میں ہے اور فاطمہ بنت قیس والی روایت (جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ کو ام شریک کے بجائے ابن ام مکتوم کے گھر عدت گزارنے کے لیے کہا تھا) عام عورتوں کے لیے ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔

امام زمخشری نے آیت نمبر ۳۵ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ جب یہ آیات ۲۸ تا ۳۴ ازواج مطہرات کے بارے میں نازل ہوئیں تو دوسری مسلمان عورتوں نے کہا کہ ہمارے بارے میں تو کچھ نازل نہیں ہوا تو آیت ۳۳ تا ۳۵ نازل ہوئی۔ حافظ ابن حجر عسقلانی حضرت سودہ کی اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے جس میں حضرت عمر نے ان کے خروج پر اعتراض کیا تھا، فرماتے ہیں کہ حجاب کے بارے میں دوسری عورتوں کو چھوڑ کر امہات المومنین پر سختی کی گئی ہے[۷]۔ پھر حافظ صاحب قاضی عیاض کا قول نقل کرتے ہیں کہ حجاب امہات المومنین کے لیے خاص ہے... ان کا خیال ہے کہ امہات المومنین کو پردے میں بھی باہر نکلنے کی اجازت نہیں۔ لیکن حافظ صاحب قاضی عیاض کے موقف کی تردید کرتے ہیں اور دلیل کے طور پر حضرت سودہ کی حدیث پیش کرتے ہیں۔ اس مکتب فکر کے حامی دلیل کے طور پر فقہ کے اصول کو پیش کرتے ہیں کہ ایسے احکام جو مخصوص نوعیت اور کسی قید سے مقید ہوں، انھیں عام کرنا درست نہیں، مثلاً ازواج کی تعداد میں جو رخصت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ثابت ہے، اس میں کسی دوسرے کو شامل نہیں کیا جا سکتا۔

اس نقطۂ نظر کے مخالف کہتے ہیں کہ جن باتوں کا حکم اللہ کے پیغمبر کی بیویوں کو دیا گیا ہے، امت مسلمہ کی دوسری عورتیں بھی ان احکام میں ان کے تابع ہیں۔ وہ دلیل کی طور پر کہتے ہیں کہ آیت نمبر ۳۳ میں ازواج کو حکم دیا گیا ہے کہ تم نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیا کرو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ یہ حکم تو سب عورتوں پر لاگو ہوگا۔ یہ اعتراض بے وزن ہے، کیونکہ نماز، زکوٰۃ اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا حکم متعدد دوسری آیات میں موجود

---

[۷] فتح الباری ۱۲: ۳۷۔

ہے، یہ حکم پہلی مرتبہ نہیں دیا گیا۔ یہاں یہ خاص حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ امہات المومنین کو زمانۂ جاہلیت کی طرح بن ٹھن کر باہر نکلنے سے منع کیا گیا ہے اور اس کے بجائے ان کی سمت سیدھی رکھنے کے لیے انھیں نماز، زکوٰۃ اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا نسخہ بتایا گیا ہے یعنی نمود و نمایش پر ان اعمال سے قابو پایا جا سکتا ہے وگرنہ وہ نماز پہلے بھی پڑھتی تھیں، زکوٰۃ بھی ادا کرتی تھیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں بھی کمی نہیں کرتی تھیں۔ یہاں پر ان اعمال کا خاص حکم ہے تاکہ اخلاقی عیوب پر قابو پالیں اور لغزش سے بچی رہیں۔ ازواج مطہرات کو یہ احکام سیاسی اور اجتماعی مصلحتوں کی وجہ سے دیے گئے ہیں۔

سورۂ احزاب کی آیت ۵۹ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اے نبی، اپنی بیویوں، اپنی بیٹیوں اور مومنوں کی عورتوں سے کہہ دیجیے کہ اپنے جلباب اپنے اوپر اوڑھ لیا کریں (یا ان میں سے کچھ نیچے کر لیا کریں) اس سے جلدی پہچان ہو جایا کرے گی تو آزار نہ دی جایا کریں گی۔''

(۵۹:۳۳)

اس آیۂ مبارکہ کو سمجھنے کے لیے دو الفاظ کی وضاحت ضروری ہے۔ جلباب اور ادناء۔ ا۔ جلباب کے درست معنی کیا ہیں؟ ۲۔ ادناء سے کیا مراد ہے؟ اور اس کی کیفیت کیا ہے؟

''مقاییس اللغہ'' میں احمد بن فارس کہتے ہیں کہ جلباب کے معنی قمیص کے ہیں اور عمرو ذی کلب کی بہن جندب کا شعر بطور دلیل پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنے بھائی کا مرثیہ کہتے ہوئے کہتی ہے:

تمشی النسور الیہ وھی لاھیة مشی العذاری علیھن جلابیب

''کرگس لاابالیانہ انداز میں اس کی طرف ایسے چل رہے ہیں جیسے دوشیزائیں جلباب پہنے چلتی ہیں۔''

کرگس کا سر اور چونچ ننگی ہوتی ہے اس پر پر نہیں ہوتے باقی بدن پر پر اتنے گھنے ہوتے ہیں کہ یوں لگتا ہے جیسے انھوں نے قمیص پہنی ہوئی ہے۔

''المفردات'' میں امام راغب کا قول ہے کہ جلباب سے مراد قمیص یا اوڑھنی ہے۔ ابن سیدہ ''المخصّص'' میں جلباب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ اوڑھنی سے بڑا اور چادر سے چھوٹا ہوتا ہے۔ اس سے عورت اپنی پیٹھ اور سینہ ڈھانپتی ہے۔ فیروز ابادی ''القاموس المحیط'' میں لکھتے ہیں کہ جلباب عبارت ہے قمیص اور ایک بڑے اور کشادہ کپڑے سے جو لحاف سے کسی قدر چھوٹا یا چادر کی طرح کا پتلا لحاف ہوتا ہے جس کے ذریعہ سے عورت اپنی پوشاک ڈھانپتی ہے یا پھر اوڑھنی سے عبارت ہے۔

صاحب لسان العرب لکھتے ہیں: ''جلباب اوڑھنی سے بڑا اور چادر (عبا) سے چھوٹا ایک لباس ہے جس سے عورت بدن ڈھانپتی ہے اور خمار سے اپنا سر اور سینہ ڈھانپتی ہے۔ پھر انھوں نے ایک قول نقل کیا ہے کہ وہ 'مقنعۃ' (اوڑھنی) کی مانند ہوتا ہے جس سے عورت اپنا سر، پیٹھ اور سینہ ڈھانپتی ہے۔ (لین) 'Lane' اپنی لغت کی مشہور کتاب 'Lexicon' میں کہتا ہے کہ یہ اوڑھنی سے بڑا اور چادر سے چھوٹا ہوتا ہے جس سے عورت اپنا سر اور سینہ ڈھانپتی ہے۔

اب دیکھتے ہیں کہ جلباب کے بارے میں مفسرین کی کیا رائے ہے۔ صاحب کشاف کہتے ہیں کہ جلباب ایک کھلا کپڑا ہے جو اوڑھنی سے بڑا اور چادر سے چھوٹا ہوتا ہے۔ عورت اسے سر پر لپیٹ لیتی ہے اور باقی کا حصہ سینے پر ڈال دیتی ہے۔ ''درمنثور'' میں ابن ابی حاتم کی روایت سے مشہور تابعی سعید بن جبیر کا قول نقل کیا گیا ہے کہ جلباب وہ چادر ہے جو اوڑھنی کے اوپر اوڑھی جاتی ہے۔ کسی مسلمان عورت کے لیے جائز نہیں کہ نامحرم اسے دیکھے اور اس کی اوڑھنی کے اوپر چادر نہ ہو اور اس نے اسے سر اور سینے پر اچھی طرح ڈالا ہوا نہ ہو۔ ''تفسیر المراغی'' میں ہے کہ جلباب سے مراد وہ چادر ہے جسے عورت قمیص اور اوڑھنی سے اوپر پہنتی ہے[8]۔ مقصد ایسا لباس ہے جو اس کے جسم اور سر کو ڈھانپ لے اور سر، سینہ اور بازو جیسے مقام زینت کو ظاہر نہ کرے۔ سید قطب فی ظلال القرآن اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ ان سے کہہ دو جب عورت گھر سے نکلے، وہ اپنے جسم، سر اور سینہ کو ڈھانپ لے۔

اہل لغت اور مفسرین کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ جلباب کا اطلاق ہر سلے اور ان سلے وسیع کشادہ کپڑے پر ہوتا تھا، خواہ وہ کھلی قمیص ہو یا چادر۔ کھلی قمیص میں ہر قسم کا گاؤن، اوورکوٹ یا عبا شامل ہے جن کا گریبان کھلا ہوتا ہے۔ آج کل گاؤن یا اوورکوٹ اسکارف سے مل کر جلباب کا مقصد بدرجۂ اتم پورا کرتے ہیں۔

یہاں اس بات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ جلباب مرد بھی پہنتے تھے۔ چنانچہ حضرت عائشہ نے صحابۂ کرام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: 'هذا جلباب رسول الله لم يبل هذا أبلی عثمان سننه'' ''یہ رہی اللہ کے رسول کی قمیص جو ابھی بوسیدہ نہیں ہوئی، مگر عثمان نے ان کی سنت کو بوسیدہ کر دیا ہے۔'' لسان العرب میں حضرت علی کا قول نقل ہوا ہے کہ 'من أحبنا اهل البيت فليعدّ جلباب الفقر '' ''جو ہم اہل بیت سے محبت کرتا ہے، اسے چاہیے کہ فقر کی قمیص تیار کرے۔'' چنانچہ جلباب کھلے پیرہن، گاؤن یا اوورکوٹ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ آج کل سوڈانی اپنے ثوب کو جلابیہ کہتے ہیں۔ تصریحات بالا سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جلباب کے معنی وہ چادریں بھی ہیں جو اوڑھنی سے بڑی اور ردا (چادر) سے چھوٹی ہوتی ہیں، یہ اوڑھنی کے اوپر پہنی جاتی ہیں اور سر، سینہ اور پیٹھ کو

۸۔ ۸:۳۰۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ڈھانپتی ہیں۔ سورۂ نور آیت ۶۰ کی تفسیر میں 'ثیاب' (کھلے کپڑے) سے مراد خمار (اوڑھنی) اور جلباب (چادر) لیے گئے ہیں یعنی سن رسیدہ عورتوں کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنے سروں کو ننگا رکھیں۔ چہرے کو ڈھانپنا جلباب کے مقصد میں قطعی شامل نہیں۔

جلباب کے معنی میں جو اختلاف ہے، وہ لفظی اختلاف ہے، معنوی نہیں۔ ایسے اختلاف کو اصول تفسیر میں نوعیت کا اختلاف کہا جاتا ہے، اس سے مراد پیرہن لے لیں یا چادر لے لیں، معانی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مگر اہل لغت کی تصریحات کی روشنی میں جلباب کو صرف چادر کے معنی تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر اس سے چادر بھی مراد لے لی جائے تو بھی جلباب صرف بدن اور اطراف کو ڈھانپے گا۔ سر اور سینے کو خمار ڈھانپے گا جیسا کہ سورۂ نور میں بیان ہوا۔ کیونکہ قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تفسیر کرتا ہے۔

زیر نظر آیت میں دوسری اہم تعبیر 'یدنین علیھن' ہے 'یدنین' کا صیغہ باب افعال کے مصدر 'ادناء' سے مضارع کا جمع مؤنث غائب کا صیغہ ہے۔ اس کا ثلاثی مجرد دنا یدنو دنواً و دناوۃً' ہے جس کے بنیادی معنی قریب ہونا ہے۔ اس سے ثلاثی مزید 'ادنیٰ' اور 'دنّی' ہے جس کے معنی ہیں، اس نے قریب کیا۔ ''مقاییس اللغۃ'' میں احمد بن فارس بن زکریا (المتوفی ۳۹۵ھ) نے 'دنّی' کے بارہ میں لکھا ہے کہ اس کے بنیادی معنی 'مقاربۃ' (قریب ہونا) کے ہیں اور 'الدنی' قریب آدمی کو کہا جاتا ہے۔ دنیا کو بھی قریب ہونے کی وجہ سے 'دنیا' کہا جاتا ہے اور 'دانیت بین الامرین' کے معنی ہیں: میں نے دو چیزوں کو باہم قریب کیا۔ اور حدیث میں ہے: 'اذا اکلتم فدنّوا' یعنی جب کھاؤ تو اپنے قریب سے کھاؤ۔ اور عربی محاورے میں کہا جاتا ہے: 'لقیتہ ادنی دنّی' یعنی میں اسے سب سے پہلے ملا۔ ''صحاح'' میں ہے: 'دنوت منہ و ادنیت غیری' یعنی میں اس کے قریب ہوا اور میں نے دوسرے کو قریب کیا۔ فیروزابادی ''القاموس المحیط'' میں لکھتے ہیں: 'دنی' وہ قریب ہوا یہ 'ادنی' اور 'دنی' کی مانند ہے جس کے معنی ہیں کہ اس نے قریب کیا۔ امام راغب ''مفردات'' میں لکھتے ہیں کہ 'الدنو' کے معنی ہیں قریب ہونا 'ادنیت بین الامرین و ادنیت احدھما'، ''میں نے دو چیزوں کو باہم قریب کیا۔'' یا میں نے ان میں سے ایک کو قریب کیا۔ یہ معنی لکھنے کے بعد انھوں نے 'یدنین علیھن من جلابیبھن' کو بطور دلیل پیش کیا ہے یعنی اپنی چادریں قریب کر لیں یعنی پہن لیں۔ ''اساس البلاغۃ'' میں زمخشری کا قول ہے کہ 'ادنت المراۃ ثوبھا و دنتہ' کے معنی ہیں کہ عورت نے اپنا کشادہ کپڑا پہن لیا۔ شاہد کے طور پر انھوں نے عمرو بن ابی ربیعہ کا شعر نقل کیا ہے:

كأن ثوبا لما التقى الركب تد نيه تشف من قمر

''جب سوار آپس میں ملے تو جو کشادہ کپڑا محبوبہ نے پہن رکھا تھا، اس میں سے چاند صاف نظر آ رہا تھا۔''

Lane کی Lexicon میں ہے کہ 'دنّی' کے فعل کے ساتھ حروف جار (Preposition) من، الی، علی اور ل استعمال ہوں گے تو معنی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی، بلکہ مطلب ہوگا: وہ قریب ہوا یا اس نے قریب کیا۔

اس بنا پر جلباب کو قریب کرنے کا مقصد اس کو پہننا ہے۔ جب کسی عورت سے کہا جاتا ہے کہ اپنے لباس کو قریب کرلو تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسے نہ چھوڑو، اسے سمیٹ کر ایک طرف نہ رکھو، اسے بے اثر اور بے خاصیت نہ جانو اور اپنے آپ کو اس سے ڈھانپ لو۔

ابن قتیبہ دینوری تیسری صدی ہجری کے معروف محقق، مفسر، محدث اور مورخ ہیں۔ اپنی معرکۃ الآرا کتاب ''مشکل القرآن وغریبہ'' کی دوسری جلد کے صفحہ ۸۱ پر لکھتے ہیں 'یدنین علیھن من جلا بیبھن ای یلبسن الاردیۃ' یعنی اس سے مراد ہے اپنی چادریں اوڑھ لیں۔

نحو اور لغت کے امام کسائی نے کہا ہے کہ 'یدنین علیھن من جلا بیبھن' سے مراد ہے کہ اپنی چادروں کو اپنے گرد سمیٹ لیں کیونکہ 'ادناء' انضمام (سمیٹنے اور اکٹھا کرنے) کے معنوں میں آتا ہے۔

'جلا بیبھن' سے پہلے حرف جار ''من'' تبعیض (Splitting) کے معنوں میں ہے۔

''کشاف'' میں اس کی دو صورتوں کا ذکر ہے[9]۔ ایک تو یہ کہ اپنے جلبابوں میں سے ایک جلباب۔ مقصد ہے کہ عورت اپنے یہاں پڑے ہوئے جلبابوں میں سے کوئی جلباب پہن لے۔ اس صورت میں 'ادنی' کے معنی پہننے کے ہوں گے۔ دوسری صورت کو بعد میں بیان کیا جائے گا۔

اگر 'ادناء' اپنے بنیادی معنوں یعنی قریب کرنا اور اوڑھنا کے لیے استعمال کیا جائے تو بات بالکل صاف ہو جاتی ہے اور اس کی کیفیت کے بارے میں کسی قسم کے اشکال کی کوئی گنجایش نہیں رہتی۔

اب آیئے دوسرے معنی کی طرف، متاخرین اہل لغت جیسے ''المصباح المنیر'' اور ''المعجم الوسیط'' کے مصنفین نے اس کے معنی نیچے کرنے اور لٹکانے کے بھی لیے ہیں۔ مفسرین نے بھی اس کے معنی نیچا کرنے اور لٹکانے کے لیے ہیں۔ صاحب کشاف کہتے ہیں کہ 'جلا بیبھن' سے پہلے حرف جار کی دوسری صورت یہ ہے کہ اپنے جلباب کا کچھ حصہ نیچے کرلو۔ صاحب روح المعانی کہتے ہیں کہ 'ادنانی' کے معنی ہیں کہ اس نے مجھے قریب کیا، مگر ضمناً اس کے معنی 'ارخاء' (لٹکانے) کے بھی آتے ہیں[10]، خصوصاً جب اس کے بعد حرف جار تعدیہ کے لیے استعمال ہوا ہو اور انھوں

---

9 ۳: ۲۷۴۔

نے مشہور تابعی سعید بن جبیر کا قول نقل کیا ہے کہ 'یدنین' کے معنی ہیں، وہ لٹکا لیں۔

کیفیت ادناء

ذہن میں یہ بات رہے کہ 'ادناء' کے معنی لٹکانا اسی صورت میں ہوں گے جب جلباب کو چادر کے معنوں میں لیا جائے، نہ کہ قمیص، اوور کوٹ اور گاؤن کے معنوں میں۔

چادر کو کتنا نیچے کیا جائے، اس بارے میں اہل تحقیق میں اختلاف ہے۔

ایک رائے تو یہ ہے کہ جلباب کو اتنا نیچے کیا جائے کہ بدن کے وہ حصے چھپ جائیں جنھیں چھپانے کے لیے عرب معاشرے میں عام طور پر جلباب پہنا جاتا تھا۔ اس بات کی پہلے وضاحت ہو چکی ہے کہ جلباب پیشانی، پیشانی کے بال، کان اور کانوں کے بندے اور گردن سینہ اور اس کا ہار چھپانے کے لیے پہنا جاتا تھا۔

امام طبری نے ''جامع البیان'' میں حضرت ابن عباس سے قتادہ کی روایت بیان کی ہے کہ جلباب کو اپنی پیشانی پر باندھ لیا جائے۔[11] لیکن مجاہد کا قول ہے کہ اپنے ابرووں پر باندھ لیا جائے۔ ابن نجیح نے مجاہد بن جبر المکی سے اثر روایت کیا ہے کہ ادناء سے مراد پیشانی پر باندھنا ہے، مجاہد نے سورۂ نور کی آیت نمبر ۳۱ کی جو تفسیر کی ہے، وہ بھی اسی رائے کی تائید کرتی ہے۔[12] ابن عباس نے ادناء کی تفسیر کی ہے: 'تدلی الجلباب الی وجھہا ولا تضرب بہ' چادر چہرے تک نیچے کی جائے گی، مگر اس کو چھپایا نہ جائے گا۔ ''درالمنثور'' میں سعید بن جبیر کا قول نقل کیا ہے کہ ادناء کا طریقہ یہ ہے کہ سر اور سینے پر جمایا جائے۔[13]

جمہور تابعین کا یہی مذہب ہے۔ مجاہد اور ان کے ہم خیال تابعین کی رائے ہے کہ ادناء کو ان مقامات زینت پر نیچا کرو جن کا اظہار جائز نہیں یعنی سورۂ نور کی آیت 'ولیضربن بخمرھن علی جیوبھن' سورۂ احزاب کی اس آیت کی تفسیر ہے۔ چونکہ سورۂ نور سورۂ احزاب کے بعد نازل ہوئی، اس سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ اس پر عمل کرنے کے علاوہ سورۂ نور میں دیے گئے حکم کی مکمل پابندی کی جائے گی۔ اگر ادناء سے مراد چہرہ چھپانا لیا جائے تو پھر سورۂ نور

۱۰؎ ۱۱:۸۸۔

۱۱؎ ۱۲:۴۹۔

۱۲؎ تفسیر مجاہد/۴۴۰ مجمع البحوث الاسلامیۃ اسلام آباد۔

۱۳؎ ۵:۲۲۲۔

کے احکام معاذ اللہ بے معنی ہو کر رہ جائیں گے۔ سورۂ احزاب کی آیت ان عورتوں کے لیے ہے جو آوارہ لوگوں کی مزاحمت سے دوچار ہوں، جبکہ سورۂ نور کی آیت ۳۱ ایک کلی اور دائمی حکم کی حیثیت رکھتی ہے، خواہ عورتوں کے لیے کوئی مزاحمت ہو یا نہ ہو۔ زیر نظر آیت میں آنے والا حکم اس دستور کی طرح ہے جو سورۂ احزاب کی آیت ۳۲ میں وارد ہوا ہے، اس آیت میں انداز سخن کی وہ کیفیت بیان کی گئی ہے جو وقار اور عصمت کی آئینہ دار ہے جبکہ زیر بحث آیت آمدورفت میں وقار کے دستور سے متعلق ہے، اس آیت میں پردے کی حدود بیان نہیں ہوئیں اور نہ ہی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ چہرے کا چھپانا واجب ہے۔ پردے کی واجبی حدود کا تعین سورۂ نور کی آیت ۳۱ میں کیا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ فقہ کے کسی امام نے وجوب ستر کے دلائل میں اس آیت سے استنباط نہیں کیا۔ زیر نظر آیت کا اسلوب بھی اسی رائے کی تائید کرتا ہے۔ جس ادناء کا حکم دیا گیا ہے، وہ مثبت صیغے میں ہے اور مثبت کا صیغہ عام حکم کے لیے استعمال ہوتا ہے اگر انداز تخاطب نفی یا نہی کے صیغے سے ہوتا تو پھر اسے خاص ادناء یعنی چہرے کو چھپانے پر محمول کیا جا سکتا تھا۔

اس رائے کے مخالفین ادناء سے مراد یہ لیتے ہیں کہ ایک آنکھ کے سوا سارا چہرہ چھپایا جائے۔ اس رائے کی تائید میں ایک اثر پیش کیا جاتا ہے جو یوں ہے:

> ''ابو صالح عبداللہ بن صالح نے معاویہ بن صالح سے اس نے علی بن ابی طلحہ سے اس نے عبداللہ بن عباس سے روایت کی ہے کہ اللہ نے مسلمان عورت کو حکم دیا ہے کہ جب وہ کسی حاجت کے لیے اپنے گھروں سے نکلیں تو اپنے سروں کے اوپر سے اپنے چہرے کو جلباب سے ڈھانپ لیں اور صرف ایک آنکھ کھلی رکھیں''

اس اثر پر ناصر الدین البانی نے اپنی کتاب 'جلباب المراۃ المسلمۃ' (حاشیہ صفحہ ۸۸) پر بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

> ''اس کی روایت ابن عباس سے درست نہیں، کیونکہ امام طبری نے اسے علی بن ابی طلحہ کی سند سے روایت کیا ہے۔ اس بات کے علاوہ کہ ائمہ حدیث نے اس پر تنقید کی ہے اور اس کے ثقہ ہونے کے بارے میں کلام کیا ہے، اس کا سماع ابن عباس سے ثابت نہیں، بلکہ انھوں نے عبداللہ بن عباس کو دیکھا تک نہیں، اس کا پہلا راوی ابو صالح عبداللہ بن صالح بھی ضعیف ہے۔ متن کے اعتبار سے بھی یہ اثر معلول ہے کیونکہ امام طبری نے بعینہٖ اسی سند سے سورۂ نور کی آیت 'الا ما ظہر منہا' کی تفسیر کے سلسلہ میں روایت کی ہے کہ ابن عباس چہرے کو، آنکھوں کے سرمے کو، ہتھیلیوں کی مہندی اور انگوٹھی کو زینت ظاہرہ میں شمار کرتے ہیں۔ یہ اثر سورۂ نور کی آیت ۳۰ سے متصادم ہے اس لیے قابل حجت نہیں۔''

لغوی لحاظ سے 'من جلابیبھن' کے معنی ہیں جلباب کا تھوڑا سا حصہ، جس سے پیشانی اور پیشانی کے بال، کان اور اس کی بالیاں چھپ جائیں اس سے پورے چہرے کا چھپانا لازم نہیں آتا۔

اختلاف رائے کا سبب

ابن العربی نے ''احکام القرآن'' میں لکھا ہے کہ رائے میں اختلاف کا سبب آیت کا یہ ٹکڑا ہے 'ذلك ادنى ان یعرفن'، ''یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے تاکہ وہ پہچان لی جائیں[14]۔'' جن لوگوں نے ادناء سے مراد چہرے کو چھپانا لیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ چہرے کو دیکھ کر پتا چلے گا کہ وہ آزاد عورت ہے یا لونڈی۔ ان کی غلط فہمی کی بنیاد آیت کی شان نزول کے بارے میں سدی کی روایت ہے جس کے مطابق عورتیں جب قضاے حاجت کے لیے نکلتی تھیں تو بدقماش لوگ ان سے چھیڑ چھاڑ کرتے تھے اور یہ عذر پیش کرتے تھے کہ ہم نے تو لونڈی سمجھ کر چھیڑا ہے، چنانچہ بعض مفسرین 'نساء المومنین' سے مراد آزاد عورتیں لیتے ہیں اور کنیزوں کو ان میں شامل نہیں کرتے، یہ سوچ غیر قرآنی ہے جیسا کہ تفسیر ''البحر المحیط'' (۷:۲۵) میں ہے کہ 'نساء المومنین' میں آزاد اور کنیزیں سب شامل ہیں، کیونکہ لونڈیوں سے چھیڑ چھاڑ کا احتمال زیادہ ہوتا ہے۔ وہ کام کاج کے لیے باہر نکلتی ہیں۔ ذہن نہیں مانتا کہ قرآن صرف آزاد عورتوں کو موردعنایت قرار دے اور کنیزوں کی آزار سے چشم پوشی کرے، حالانکہ اللہ کا دین ایک ہے، فطرت ایک ہے پھر آزاد اور لونڈی میں فرق کیوں؟ آیت کے اس ٹکڑے کی صحیح تفسیر یہ ہے کہ جب عورت باوقار لباس پہن کر نکلے گی تو آوارہ منش لوگوں کو ان کو چھیڑنے کی جرأت نہ ہوگی۔ یہ ایک امتیازی نشان ہوگا جس سے پہچان ہو جائے گی کہ وہ باعصمت عورتیں ہیں آوارہ نہیں۔ آیت کی شان نزول کے بارے میں درج ذیل آیات اسی تفسیر کی تائید کرتی ہیں۔

۱۔ امام طبری اپنی تفسیر میں روایت بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو آپ کی بیبیاں اور دوسری عورتیں قضاے حاجت کے لیے باہر نکلتی تھیں۔ یہ لوگ چھیڑ چھاڑ کرنے کے لیے راستوں پر بیٹھ جاتے اس پر یہ آیت نازل ہوئی[15]۔

۲۔ ''زاد المسیر'' میں روایت ہے کہ مدینہ کے کچھ لوگ عورتوں کو دیکھنے کے لیے راستوں میں بیٹھ جاتے۔ انھیں چھیڑتے اور ان کا پیچھا کرتے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ ان روایات میں آزاد عورتوں اور لونڈیوں کی کوئی تخصیص

---

۱۴ ۳:۱۵۸۶۔

۱۵ ۱۲:۴۹۔

نہیں۔[16]

ایک اور لطیف نکتہ یہ ہے کہ ادنیٰ کے لفظ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اوباشوں کی دل آزاری سے بچنے کا صرف یہی طریقہ نہیں، یہ تو ادنیٰ سی حفاظتی تدبیر ہے جس سے پاک باز عورتوں کے وقار میں اضافہ ہوگا۔ صرف اس لباس کی وجہ سے وہ فاسقوں کی زبان سے محفوظ نہیں رہ سکتیں، یہ تو کمال کی ایک علامت ہے کہ اصل کمال یہ ہے کہ عورت کے اندر تقویٰ کا مانع (deterrent) ہو۔

مختصر یہ کہ زیر نظر آیت سے چہرے کا ڈھانپنا نہ منطوق کے اعتبار سے اور نہ مفہوم کے اعتبار سے ثابت ہوتا ہے۔ جلباب کی غرض انھی مقامات کو ڈھانپنا ہے جس کی تفصیل سورۂ نور میں ہے، کیونکہ سورۂ نور کا حکم مستقل حکم ہے۔

سورۂ نور کی آیت ۳۰ اور ۳۱ میں پردے کی واجبی حدود کو متعین کیا گیا ہے۔ قرآن حکیم کی کوئی دوسری آیت ان حدود کا تعین نہیں کرتی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

> ''مومنوں سے کہہ دیجیے کہ اپنی نظریں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کیا کریں۔ یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزہ ہے۔ اللہ اس سے باخبر ہے جو وہ کرتے ہیں اور مومن عورتوں سے کہہ دیجیے کہ اپنی نظریں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں سوائے اس کے جو کھلی رہتی ہے اور چاہیے کہ اپنی اوڑھنیاں اپنے سینوں پر ڈال لیں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں سوائے اپنے خاوندوں کے یا اپنے باپوں کے...'' (۲۴: ۳۰، ۳۱)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

شان نزول

امام سیوطی نے ''الدرالمنثور'' میں روایت کیا ہے ایک دن مدینہ کے گرم موسم میں ایک خوب صورت نوجوان عورت ایک راستہ پر اس طرح چل رہی تھی کہ جاہلی رواج کے مطابق دوپٹہ گردن کے پیچھے لٹک رہا تھا۔ اس کا گریبان اور گردن کھلی تھی۔ ایک صحابی سامنے سے آرہے تھے، وہ اس خوب صورت عورت کو دیکھتے ہی رہ گئے اور بے خبری میں آگے چلتے گئے یہاں تک کے دیوار سے باہر نکلی ہوئی کسی چیز سے ان کا چہرہ زخمی ہوگیا۔ وہ اسی حالت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور سارا ماجرا کہہ سنایا۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی[17] ہوسکتا ہے کہ آیۂ مبارکہ پہلے نازل ہوئی ہو اور اس واقعہ پر چسپاں کردی گئی ہو۔ بہرکیف اس روایت سے اتنا تو واضح

[16] ۶: ۴۲۳۔

[17] ۵: ۴۰۔

ہوتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں عورتیں اپنے سروں کو اوڑھنیوں سے ڈھانپ کر ان کو پیٹھ پر لٹکا لیتی تھیں جس سے ان کے کان، گردن اور سینہ کا اوپر والا حصہ بے پردہ ہو جاتا تھا۔

غض بصر

شرم گاہ کی حفاظت سے پہلے نظریں نیچی کرنے کا حکم اس لیے دیا گیا کہ نگاہیں دل کی رہبر ہوتی ہیں، اس لیے انسان زیادہ ٹھوکر انھی کی وجہ سے کھاتا ہے۔ امام قرطبی کے قول کے مطابق نگاہیں دل کا مین گیٹ ہوتی ہیں۔ اسی لیے امام غزالی کا قول ہے کہ جو نگاہیں نیچی رکھنے پر قدرت نہیں رکھتا، وہ زنا سے بچنے پر بھی قدرت نہیں رکھتا۔

امام راغب ''مفردات'' میں لکھتے ہیں کہ 'غض' کے معنی کمی کے ہیں، خواہ یہ کمی نظر میں ہو یا آواز میں یا برتن میں، کچھ کم کرنے کی صورت میں مثال کے طور پر انھوں نے یہی آیت پیش کی ہے۔ عربی زبان میں دو لفظ 'غمض' اور 'غض' آنکھ کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔ پلکوں کو ایک دوسرے پر سلا دینا 'غمض' کہلاتا ہے اور اس سے ترک نگاہ کا مفہوم نکلتا ہے، جبکہ نظر کو کم کرنا 'غض' کہلاتا ہے جس سے نگاہ کو محدود کرنے یا بچانے کا مفہوم نکلتا ہے۔

جب انسان آنکھیں کھول کر دنیا میں رہے گا تو سب چیزوں پر اس کی نظر پڑے گی یہ تو ممکن نہیں کہ کوئی مرد کسی عورت کو اور کوئی عورت کسی مرد کو نہ دیکھے۔ اسی لیے شارع علیہ السلام نے حضرت علی سے فرمایا: ''اے علی ایک نظر کے بعد دوسری نظر نہ ڈالنا، پہلی نگاہ تو تیری ہے (یعنی فطری ہے) دوسری نگاہ تیری نہیں (یعنی غیر فطری ہے)۔'' اس روایت کو ابوداؤد، ترمذی اور مسند احمد میں روایت کیا گیا ہے۔ جس چیز سے منع کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ آپ کی اچانک نگاہ پڑ گئی تو اس کے بعد مقام حسن پر آپ نے دوبارہ نظر دوڑائی اور گھورتے ہی چلے گئے۔ یعنی ایسا دیکھنا جس کی نہ ضرورت ہو اور نہ ہی اس کا تمدنی فائدہ ہو اور جس میں شہوانی جذبات کو تحریک دینے کے اسباب موجود ہوں۔

نگاہ دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک انسان دوسرے انسان کو اس لیے دیکھتا ہے کہ اس سے بات کر رہا ہوتا ہے۔ دیکھنا گفتگو کا لازمہ ہے، اس نگاہ کو علماے اصول کی اصطلاح میں عمومی نگاہ کہتے ہیں۔ اس میں کوئی ممانعت نہیں۔ دوسری نگاہ کسی شخص کا سراپا جانچنے کے لیے ہوتی ہے، اس وقت پوری توجہ سے پورے وجود کا بھرپور نگاہ سے جائزہ لیا جاتا ہے۔ اہل اصول کی اصطلاح میں اسے خصوصی نگاہ کہا جاتا ہے اور یہ ممنوع ہے۔

اس آیت کا مطالعہ دو باتوں پر دلالت کرتا ہے۔ ایک تو یہ کہ عورت یا مرد کے اعضا میں کوئی چیز کھلی ہے جس پر نگاہ پڑ سکتی ہے۔ اس لیے مرد اور عورت، دونوں کو نظریں بچانے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ کھلی چیز چہرے اور ہاتھوں کے علاوہ

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اورکون سی ہوسکتی ہے؟ اگر چہرہ چھپا ہوا ہوتو پھر نظریں نیچی کرنے یا بچانے کا حکم بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ آیت چہرہ کھلا رکھنے کے لیے قطعی نص کا درجہ رکھتی ہے۔ چہرے سے ہٹ کر دوسرے مقامات پر نگاہ ڈالنا غض بصر کے ساتھ بھی ناجائز ہے، دوسرے اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس حکم کا تعلق ان مقامات سے ہے جہاں غیر مردوں اور غیر عورتوں کا سامنا ہوتا ہے جیسے راستہ اور بازار۔ اس کی دلیل وہ حدیث ہے جسے بخاری، مسلم، ابوداؤد اور مسند احمد نے بیان کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''راستے میں نہ بیٹھا کرو اور اگر تمھیں بیٹھنا ہی پڑے تو راستے کا حق ادا کرو، صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول راستے کا حق کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: نگاہیں نیچی کرنا۔'' شیخ محمد غزالی نے 'السنة النبوية بين الحديث و الفقه' میں لکھا ہے کہ قاضی عیاض اور امام شوکانی نے اپنے ہم عصر علما کی رائے نقل کی ہے کہ عورت، راستہ چلتے وقت اپنا چہرہ نہ ڈھانپے، بلکہ مردوں پر واجب ہے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں۔ اسلام کا مقصد یہ ہے کہ جنسی لذت جائز طریقے سے گھر کے اندر محدود ہو اور باہر کی فضا صاف ستھری رہے۔ قرآنی نص عفت وحشمت کے سلسلہ میں مرد اور عورت کو برابر کا حکم دیتی ہے، بلکہ پہلے مرد کو حکم دیتی ہے۔ ہماری عادت سی بن گئی ہے کہ صرف عورت کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اس بارے میں اسلام کی تعلیمات پر عمل کرے۔

ترک نظر اور پاک دامنی کے دو فریضے جو مردوں کے لیے بیان ہوئے ہیں، عورتوں کے لیے بھی انھی الفاظ کے ساتھ واجب العمل ہیں۔ اس قسم کے احکامات نوع بشر کی بہتری کے لیے نافذ ہوئے ہیں۔ اسلامی قوانین مردوں کے امتیاز کی بنیاد پر استوار نہیں ہوئے ہیں۔ وگرنہ یہ تمام واجبات عورت کے لیے ہونے چاہییے تھے اور مرد ان سے بری الذمہ ہوتے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

پس منظر

تفسیر کشاف میں ہے کہ عرب عورتیں عام طور پر ایسے کرتے پہنا کرتی تھیں جن کے گریبان کھلے ہوا کرتے تھے جن میں سے ان کی گردنیں اور سینہ نمایاں ہوتا تھا جو کپڑا وہ دوپٹے کے طور پر اوڑھتی تھیں، وہ بھی سر کے پیچھے سے کاندھوں پر اس طرح ڈالا جاتا تھا کہ اس سے کان، سینہ اور گردن سب کے سب کھلے رہتے تھے یہ آیت حکم دیتی ہے کہ وہ سر پر اوڑھے ہوئے اسی دوپٹے کے لٹکے ہوئے دونوں حصوں کو اپنے سینے اور گریبان پر اس طرح ڈال لیں کہ بدن کے مذکورہ حصے اچھی طرح چھپ جائیں۔

'لا يبدين زينتهن الا ما ظهر منها'، ''وہ اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں سوائے اس کے جو خود بخود ظاہر ہو جاتی ہے۔''

زینت عبارت ہے ان چیزوں سے جن سے عورت اپنے آپ کو آراستہ کرتی ہے۔ زینت کی دو قسمیں ہیں: ظاہری زینت اور مخفی زینت۔ ظاہری زینت وہ ہے جو عادتاً اور طبعاً ظاہر ہو جاتی ہے اور اسے چھپانے کے لیے تکلف سے کام لینا پڑتا ہے۔ اس کا چھپانا واجب نہیں، جبکہ مخفی زینت کا چھپانا واجب ہے۔ ظاہری زینت میں سرمہ، مہندی، انگوٹھی اور چھلا وغیرہ شامل ہیں جن کے ظاہر ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں، کنگن، بازو بند، گلوبند، کمر بند اور بالیاں مخفی زینتیں ہیں جن کو صرف انھی لوگوں کے سامنے آشکار ہونا چاہیے جنھیں آیت نے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ جن زینتوں کا ظاہر کرنا جائز ہے، ان مقامات زینت کا بھی ظاہر کرنا روا ہے اور جن زینتوں کو چھپانا واجب ہے، ان مقامات کو بھی چھپانا واجب ہے۔

آیت کے اس ٹکڑے کے بارے میں تین اقوال ہیں: ایک قول تو یہ ہے کہ ظاہری زینتوں سے مراد سرمہ، مہندی اور انگوٹھی ہیں۔ چنانچہ اس سے مراد وہ مقامات زینت بھی ہیں جن کو ان زینتوں سے سجایا جاتا ہے مثلاً چہرہ اور کلائی تک دونوں ہاتھ، یہ قول ابن عباس کا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ آشکار زینت سے مراد صرف چہرہ اور کلائیوں تک دونوں ہاتھ ہیں۔ یہ قول عبداللہ بن عمر اور تابعی ضحاک اور عطاء کا ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ آشکار زینت سے مراد لباس (اوپر والا) ہے۔ پاؤں کی جھانجن، بالیاں اور چوڑیاں مخفی زینت ہے۔ یہ قول عبداللہ بن مسعود کا ہے۔

پہلے دونوں اقوال کا مفہوم تھوڑے فرق کے ساتھ ایک جیسا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس ظاہری زینت اور اس کے مقامات کو چھپانا واجب نہیں سمجھتے، جبکہ عبداللہ بن عمر کے قول کے مطابق صرف ظاہری مقامات زینت کو زینت کے بغیر چھپانا واجب نہیں۔ دونوں اقوال کے مطابق چہرہ اور کلائی تک دونوں ہاتھ کھلے رہنے چاہییں۔ صحابہ میں حضرت عائشہ نے اور تابعین میں سے سعید بن جبیر، مجاہد، مسور بن مخرمہ، عبدالرحمان بن زید، عکرمہ، جابر بن زید، عطاء بن ابی ریاح اور ضحاک نے ان دونوں میں سے کسی ایک قول کی تائید کی ہے۔

تیسرے قول کی سند معلول ہے۔ عبداللہ بن مسعود کا قول ابو اسحاق سبیعی نے ابوالاحوص سے روایت کیا ہے۔ اس میں ابو اسحاق سبیعی، مختلط اور مدلّس ہے۔ اس کے علاوہ روایت میں عنعنہ ہے (دیکھیے حافظ ابن حجر عسقلانی کی طبقات المدلسین۔ ص: ۴۰) یہی وجہ ہے کہ اسے کسی صحابی نے قبول نہیں کیا 'الا ما ظھر منھا' سے مراد بالائی لباس لینا قرآن حکیم کی بلاغت کے منافی ہے۔ اس آیت میں 'زینتھن' کا لفظ دو مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ علم بیان میں

اسم معرفہ کا ذکر کر کے جب اسے دہرایا جائے تو مراد پہلے والا اسم معرفہ ہوتا ہے۔ اگر پہلے 'زینتھن' سے مراد بالائی کپڑے لیے جائیں تو مراد یہ ہوگی کہ محارم کے لیے بھی سوائے بالائی کپڑوں کے کوئی اور زینت دیکھنا حرام ہے۔

اس حکم میں ہر دیکھنے والے کے لیے نہی مطلق ہے۔ اس اطلاق سے دو باتیں مستثنیٰ ہیں۔ ان میں سے ایک کا تعلق زینت کے اطلاق سے ہے۔ پہلے استثنا میں اس زینت کی تخصیص ہے جس کا دکھانا جائز ہے۔ دوسرے کا تعلق ناظرین کے اطلاق سے ہے جن کے سامنے زینتوں میں سے کچھ کا ظاہر کرنا جائز ہے۔ چنانچہ ان ناظرین میں محارم کی تخصیص کر دی گئی ہے۔ پہلے استثنا نے زینت کی اس مقدار کو متعین کیا ہے جس کا عام افراد پر آشکار ہونا جائز ہے اور دوسرے استثنا میں چند معین افراد کے نام لیے ہیں جن پر مخفی زینتوں کا ظاہر کرنا جائز ہے۔ پہلے استثنا میں بدن کے مقامات زینت کے لحاظ سے دائرہ محدود ہے اور افراد کے اعتبار سے لامحدود۔ دوسرا استثنا اس کے برعکس ہے یہی آیت کے ظاہری معنی ہیں اور کسی واضح دلیل کے بغیر ظاہری معنوں کو ترک نہیں کیا جا سکتا۔ بنیادی طور پر ابن مسعود کی طرف منسوب نظریہ قابل توجہ نہیں۔ خود بخود آشکار ہونے والی زینت سے مراد اس نظریے کے مطابق اوپر والا لباس ہوگا، کیونکہ نیچے پہنا جانے والا لباس دیکھا نہیں جا سکتا۔ اس صورت میں اس کا کوئی مفہوم نہیں نکلتا کہ عورتیں اپنی زینت کو آشکار نہ کریں، مگر وہ لباس جو اوپر پہنا جا رہا ہے۔ اوپر پہنا جانے والا لباس تو چھپایا نہیں جا سکتا کہ اس سے استثنا کیا جائے۔ اس کے مقابلہ میں وہ تمام چیزیں جو ابن عباس اور ابن عمر کے اقوال میں مذکور ہیں یہی وہ زینتیں ہیں جن کو چھپانے سے مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے۔

اس کے علاوہ لباس کو اس وقت زینت شمار کیا جا سکتا ہے جب بدن کا کوئی حصہ نمایاں ہو مثلاً پردے سے بے نیاز عورت کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ اس کا لباس اس کی زینت ہے، لیکن اگر عورت پورا بدن ایک ہی لباس (جلباب) سے ڈھانپ لے تو ہم اس لباس کو زینت نہیں کہہ سکتے۔ چنانچہ معروف حنفی فقیہ ابوبکر جصاص احکام القرآن[18] میں فرماتے ہیں کہ ابن مسعود کا قول کہ اس سے مراد ظاہری لباس ہے، بے معنی ہے کیونکہ زینت سے مراد وہ عضو ہے جسے مزین کیا گیا ہو۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان تمام زیورات کا مردوں کو دکھانا جائز ہے جو عورت نے نہ پہنے ہوں پس معلوم ہوا کہ زینت سے مراد عضو زینت ہے اسے کپڑوں سے تعبیر کرنا بے معنی ہے، کیونکہ بدن کے علاوہ کپڑوں کو دیکھنا ایسا ہی ہے جیسا کہ آپ انھیں نہ پہننے کی صورت میں دیکھ رہے ہوں۔ عبداللہ بن مسعود کا اپنا قول ہے کہ 'نعم ترجمان القرآن عبدالله ابن عباس'، ''قرآن کے بہترین ترجمان عبداللہ بن عباس ہیں'' یہی وجہ ہے کہ

۱۸؎ ۳:۲۱۶

قدیم وجدید مفسرین نے اسی رائے کی تائید کی ہے جو ابن عباس اور ابن عمر کے اقوال میں ظاہر کی گئی ہے۔

چہرے کو کھلا رکھنے کی حکمت

امام طبری اپنی تفسیر میں 'الا ما ظھر منھا' کی تفسیر میں مختلف روایات نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ بہترین قول یہ ہے کہ

''اس سے مراد چہرہ اور دونوں ہاتھ ہیں۔ اس میں سرمہ، مہندی اور انگوٹھی شامل ہیں۔ یہ بہترین قول اس لیے ہے کہ اس بات پر اجماع ہے کہ ہر نمازی عورت نماز کے دوران میں اپنا سر ڈھانپ لے۔ اپنا چہرہ اور ہاتھ کھلے رکھے اور باقی سارا بدن ڈھانپ لے۔ ہاں، ایک روایت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کے لیے نصف بازو کھلا رکھنا جائز قرار دیا ہے (یہی امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے) جب اس بات پر اجماع ہے تو معلوم ہوا کہ عورت اس حصہ کو کھلا رکھ سکتی ہے جو ستر نہیں، کیونکہ جو ستر نہیں اس کا ظاہر کرنا بھی حرام نہیں۔ مرد کے بارے میں بھی یہی حکم ہے تو معلوم ہوا کہ اللہ کے قول 'الا ما ظھر منھا' سے بھی یہی مراد ہے، کیونکہ یہی وہ چیز ہے جو ظاہر رہتی ہے۔ یعنی بدن کے وہ حصے جو نماز میں چھپے رہتے ہیں، نامحرم کے سامنے بھی ان کو چھپانا ضروری ہے اور جن حصوں کو نماز میں کھلا رکھنا جائز ہے، نامحرم کے سامنے ان کو ڈھانپنا واجب نہیں۔ درون نماز اور بیرون نماز ستر میں کوئی فرق نہیں۔''
(۱۱۹:۱۰)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

علامہ زمخشری نے کشاف میں اس استثنا کو زیادہ حکیمانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''عورت کے لیے چہرے اور ہاتھوں کا چھپانا دشوار ہے۔ اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں کہ وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے چیزیں اٹھائے اور اپنا چہرہ کھلا رکھے خاص طور پر جہاں اس نے مقدمات میں گواہی دینی ہو یا شادی بیاہ کے موقع پر اسے گلی کوچوں میں راستہ طے کرنا پڑے اور چلتے ہوئے خواہ مخواہ اس کے پاؤں دکھائی دیں خاص طور پر ان غریب عورتوں کے پاؤں نہیں چھپ سکتے جن کے پاس موزے اور کبھی کبھی جوتا بھی نہیں ہوتا۔ یہ ہے 'الا ما ظھر منھا' کا مفہوم اس کے معنی یہ ہیں: مگر وہ جو عادتاً اور طبعاً ظاہر ہو جاتی ہیں۔'' (۶۱:۳)

امام فخر الدین رازی اپنی تفسیر میں قفال کی رائے پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''چونکہ معاشرت کی ضرورت اس بات کی متقاضی ہے کہ چہرہ اور کلائی تک دونوں ہاتھ کھلے رہیں اور شریعت اسلام ایک آسان شریعت ہے، اس لیے چہرہ اور کلائی تک دونوں ہاتھوں کا چھپانا واجب قرار نہیں دیا گیا۔''
(۲۰۵:۲۲)

ابن العربی ''احکام القرآن'' میں فرماتے ہیں:

''درست بات یہ ہے کہ ہر لحاظ سے اس سے مراد چہرہ اور ہاتھ ہیں، کیونکہ یہی عادتاً اور عبادتاً کھلے رہتے ہیں۔ حالت احرام میں بھی اور نماز میں بھی اور یہی استثنا کا سبب ہے۔'' (۱۳۶۹:۳)

امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں ابن عطیہ کا قول نقل کیا ہے کہ:

''استثنا کا سبب وہ حرکت ہے جس کے بغیر چارہ نہیں یا اس کا سبب اصلاح احوال ہے جس کے بغیر عورت اپنے کام درست طور پر انجام نہیں دے سکتی۔ اس لیے عورت کو اس میں چھوٹ دی گئی ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسی بات کو استثنا کا سبب قرار دیا جائے۔'' (۲۲۶:۱۲)

طنطاوی جوھری اپنی تفسیر ''الجواھر'' میں اس آیۂ مبارکہ کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ:

''سوائے اس کے کہ جن چیزوں کو لیتے دیتے وقت ظاہر ہونا پڑے۔ مثلاً کپڑے، انگوٹھی، سرمہ، ہاتھ کی مہندی، چہرہ اور پاؤں، کیونکہ ان چیزوں کو چھپانا بہت بڑی رکاوٹ کا سبب بنتا ہے۔ عورت چیز کو ہاتھ سے ہی پکڑے گی پھر شہادت، علاج معالجے اور تجارتی لین دین میں تو اسے چہرہ کھلا رکھنا پڑے گا اور یہ سب اس وقت تک ہے جب مرد کو فتنہ کا ڈر نہ ہو وگرنہ وہ اپنی نگاہیں نیچی کر لیں۔''

ان بالغ نظر مفسرین نے پہلے استثنا کے دو سبب بیان کیے ہیں: ایک عادت کے اعتبار سے اور دوسرا عبادت کے اعتبار سے۔ اس سے اس غلط فہمی کا ازالہ ہو جاتا ہے جو ہمارے مذہبی پیشوا لوگوں کے ذہن میں پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ''حجاب'' اور ''ستر'' میں فرق ہے، حالانکہ درون نماز اور بیرون نماز ستر میں قطعی کوئی فرق نہیں۔

عادتاً چہرے اور ہاتھوں کو کھلا رکھنا پڑتا ہے اور انھیں چھپانے کے لیے تکلف کرنا پڑتا ہے، کیونکہ اس کے بغیر عورت معاشرے میں انسانی حیثیت سے سرگرم عمل نہیں رہ سکتی۔ آسودہ حال لوگوں کو چھوڑ کر مسلمانوں اور غیر مسلموں میں بھاری اکثریت ان لوگوں کی ہے جن کو اشغال زندگی میں مل جل کر جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ بہت ہی کم تعداد ان لوگوں کی ہے جو معاش کے کاروبار میں مرد اور عورت کا حصہ لیے بغیر گزارہ کر سکتے ہیں۔ غربت کی ماری عورت کو گھر سے باہر نکل کر تلاش معاش میں سرگرداں رہنا پڑتا ہے۔ شہروں میں وہ گھروں میں جھاڑو پوچا لگاتی ہے، سڑک پر روڑی کوٹتی ہے، سر پر اینٹیں رکھ کر تعمیر کے کام میں حصہ لیتی ہے، بھٹوں پر اینٹیں تیار کرتی ہے، دیہات میں وہ مردوں کے شانہ بشانہ ابتدائے آفرینش سے کام کر رہی ہے اور کام کرتی رہے گی۔ سر پر گھاس پھونس کا گٹھا اٹھاتی ہے۔ دور دراز سے سر پر گھڑے رکھ کر پانی لاتی ہے۔ چہرے اور ہاتھ کھولے بغیر وہ یہ کام کیسے کر سکتی ہے؟ گاؤں کی معیشت کا انحصار ہی اس بات پر ہے کہ مرد اور عورت مل جل کر کام کریں۔ عہد نبوت میں اور اس کے بعد بھی ایسا ہی

ہوتا رہا ہے۔اس سلسلہ میں ''طبقات ابن سعد'' کی آٹھویں جلد اور ''اسد الغابہ'' اور ''الاصابۃ'' کی آخری جلدوں کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔امام ناصر الدین البانی نے اپنی کتاب 'جلباب المراة المسلمة 'میں صفحہ ۶۰ سے لے کر صفحہ ۷۲ تک ۱۳ مستند احادیث پیش کی ہیں اور یہ ثابت کیا ہے کہ عہد نبوت میں صحابیات کا چہرہ اور ہاتھ کھلے ہوتے تھے اور ساتھ یہ بھی ثابت کیا ہے کہ یہ سب احادیث پردے کے وجوب کے بعد کی ہیں۔اس کے علاوہ اس کتاب کے صفحہ ۹۶ سے لے کر صفحہ ۱۰۳ تک ۱۶ آثار پیش کیے گئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عہد نبوت کے بعد بھی عورتیں چہرہ ڈھانپے بغیر مختلف نوعیت کے فرائض سرانجام دیتی رہی ہیں۔حال ہی میں مصر کے ایک محقق عمر رضا کحالہ نے 'أعلام النساء' کے نام سے ایک کتاب پانچ جلدوں میں لکھی ہے۔اس کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان عورتیں ہر زمانے میں سیاسی، سماجی اور ثقافتی سرگرمیوں میں کھلے چہرے کے ساتھ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی رہی ہیں یا کم از کم مولانا سعید احمد انصاری کی کتاب ''سیرت صحابیات'' کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے جس میں مصنف نے صحابیات کے مذہبی، سیاسی، علمی اور عملی کارناموں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

دور حاضر میں جس مسلمان ملک میں عورتیں احتجاج کے لیے نکلتی ہیں، وہ کھلے چہرے کے ساتھ نکلتی ہیں خواہ وہ ملک ایران ہو، مصر ہو یا ترکی ہو۔ بڑھتے ہوئے وقت کے تقاضوں نے ہمارے مذہبی رہنماؤں کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ شہر میں بسنے والی خواتین کی دونوں آنکھوں کو کھولنے کی اجازت دے دیں حالانکہ جس ضعیف اثر کے سہارے وہ جمہور علما کی مخالفت کرتے تھے، اس میں ہمیں صرف ایک آنکھ کو کھلا رکھنے کا حکم ہے۔اور وہ دن دور نہیں جب بڑھتے ہوئے وقت کا تقاضا انھیں پورا چہرہ کھلا رکھنے کی اجازت پر مجبور کر دے گا، کیونکہ پورے چہرے میں حسین ترین بولنے والی چیز آنکھیں ہی تو ہوتی ہیں۔آج سے کچھ برس اوپر اسمبلیوں جیسے مخلوط اجتماعات سے خطاب کرنا غیر اسلامی سمجھا جاتا تھا، مگر آج متحدہ مجلس کے علما نہ صرف اسمبلیوں میں خطاب کرتے ہیں، بلکہ اپنے سیاسی مقاصد کے لیے ان کو سڑکوں پر بھی گھسیٹ لاتے ہیں:

بہ بیں تفاوت راہ است از کجا تا بہ کجا

چنانچہ قرآن حکیم کا منشا بھی یہی ہے کہ ان اعضا کو کھلا چھوڑا جائے جن کو ضروریات انسانی کے زیر اثر عادتاً کھلا چھوڑا جاتا ہے اور اس کے علاوہ مخفی زینت کے مقامات کو چھپا کر رکھا جائے۔

عبادتاً یعنی جس طرح نماز اور حج میں چہرے اور ہاتھوں کو کھلا رکھا جاتا ہے، عام حالت میں بھی اسے کھلا رکھا جائے گا۔ یہ کہنا بعید از عقل ہے کہ حالت احرام کے علاوہ چہرہ کھلا رکھنا حرام ہے۔مناسک حج و عمرہ کی ادائیگی میں عورت

مردوں کے انبوہ کثیر میں گھری ہوتی ہے۔ اگر عورت کے لیے چہرہ چھپانا واجب ہوتا تو اس موقع پر اس کی رعایت ضروری ہوتی۔ عورت سے یہ نہیں کہا گیا کہ وہ اپنا سر کھلا رکھے، بلکہ صرف چہرہ کھلا رکھنے کا حکم ہے۔ اگر شارع علیہ السلام حالت احرام میں پردے سے صرف نظر کرنا چاہتے تو ممکن ہے کہ وہ عورت کے لیے بھی سر کی برہنگی لازم قرار دیتے۔ فقہا میں سے کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ شارع علیہ السلام کا مقصد یہ ہے کہ حالت احرام میں پردے سے متعلق استثنا کو مدنظر رکھا جائے۔ بہت سے مقامات پر جہاں پردے یا نگاہ کے جواز یا عدم جواز کے بارے میں گفتگو ہے سائلین اور فقہا کے درمیان صرف بالوں کا مسئلہ زیر بحث آیا ہے، چہرے کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ شارع نے حج اور نماز میں چہرہ کھلا رکھنے کا حکم دیا ہے۔ تا کہ عام حالات میں چہرہ ڈھانپا جائے۔ یہ طرز استدلال اس لیے غلط ہے کہ اللہ نے حج کے دوران میں مردوں کو سر کھلا رکھنے کا حکم دیا ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ عام حالات میں ان کے لیے سر ڈھانپنا واجب ہے؟ عورت کے جو اعضا عادتاً کھلے رہتے ہیں، عبادت میں بھی وہی کھلے رہیں گے۔ اس سے اس شبہ کا ازالہ بھی ہو جاتا ہے جو ہمارے مذہبی پیشوا یہ کہہ کر ڈالتے ہیں کہ حجاب اور ہے اور ستر اور۔

مذکورہ بالا مفسرین کے علاوہ حافظ ابن کثیر، صاحب روح المعانی، صاحب البحر المحیط، صاحب التسہیل اور دور حاضر میں صاحب تفسیر المراغی، سید قطب شہید، شیخ عبدالحمید کشک اور شیخ محمد طاہر بن عاشور نے بھی 'الا ماظھر منھا' کی یہی تفسیر لکھی ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

پردے کا معیار

'ولیضربن بخمرھن علی جیوبھن'، ''چاہیے کہ وہ اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں پر ڈال لیں۔'' میں پہلے بھی تفسیر کشاف کے حوالہ سے بیان کر چکا ہوں کہ عرب عورتیں دوپٹہ اسی طرح اوڑھتی تھیں کہ وہ سر کے پیچھے سے کاندھوں پر اس طرح ڈال لیا جاتا تھا کہ اس سے کان، سینہ اور گردن، سب کے سب نمایاں رہتے تھے۔ آیت کا یہ ٹکڑا حکم دیتا ہے کہ وہ سر پر اوڑھے ہوئے اسی دوپٹے کے دونوں لٹکے ہوئے حصوں کو اپنے سینے اور گریبان پر اس طرح ڈال لیں کہ بدن کے مذکورہ حصے اچھی طرح چھپ جائیں۔ ابن عباس نے اس کی تفسیر یوں کی ہے۔ 'تغطی شعرھا وصدرھا وترائبھا وسوالفھا' یعنی عورت پر لازم ہے کہ وہ اپنے بال، سینہ، سینے کا بالائی حصہ، گردن اور اطراف گردن کو ڈھانپے رکھے۔ یہ آیت پردے کی حدود کا تعین کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ پردے کا معیار کیا ہے؟

حرف 'علی' کے ساتھ 'ضرب' کا فعل کسی چیز کو دوسری چیز پر اس طرح رکھ دینے کے مفہوم کو پیش کرتا ہے کہ وہ

چیز دوسری چیز کے لیے اوٹ (حاجب) بن جائے۔ سورۂ کہف میں ہے 'فضربنا علی آذانھم' پس ہم نے ان کے کانوں پر پردہ (حجاب) ڈال دیا (تا کہ وہ سن نہ سکیں) (۱۸:۱۱)۔

یہ آیت بڑی وضاحت کے ساتھ عورت کے پردے کی واجبی حدود کو ظاہر کرتی ہے کیونکہ آیت میں اوڑھنی کے دونوں سروں کو گریبان پر ڈالنے کی گفتگو ہے، اس لیے پردے کی یہی مقدار ہمارے لیے واجب ہے۔

محدثین کا نقطۂ نظر

سنن ابی داؤد میں حضرت عائشہ سے ایک حدیث مروی ہے کہ اسماء بنت ابی بکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں آئیں۔ انھوں نے بہت باریک کپڑے پہن رکھے تھے۔ چنانچہ آپ نے منہ موڑ لیا اور فرمایا: اے اسماء جب عورت حیض کی عمر کو پہنچ جائے تو پھر مناسب نہیں کہ اس کے بدن کا کوئی حصہ سوائے اس کے نظر آئے۔ پھر آپ نے اپنے چہرے اور ہاتھ کی طرف اشارہ کیا۔ اس حدیث میں ایک علت ہے کہ یہ مرسل ہے۔ لیکن اس کی تقویت اس حدیث سے ہوتی ہے جسے طبرانی نے ''المعجم الکبیر'' اور ''المعجم الاوسط'' میں روایت کیا ہے۔ پھر اسے امام بیہقی نے روایت کیا ہے۔ امام بیہقی حضرت عائشہ کی روایت اور 'الا ما ظھر منھا' کی ابن عباس کی تفسیر کے بعد فرماتے ہیں کہ ''دیگر صحابہ نے زینت ظاہرہ کی جو تعریف کی ہے، اس سے اس روایت کو تقویت ملتی ہے۔ امام ذھبی تہذیب سنن البیہقی (۱:۲۸) میں اس رائے کی تائید کرتے ہیں۔ ابن ابی شیبہ نے المصنف[۱۹] میں ابن عباس کی روایت نقل کی ہے جسے زیاد بن ربیع نے صالح الدھان سے انھوں نے جابر بن زید سے اور انھوں نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ 'الا ما ظھر منھا' سے مراد چہرے اور ہاتھ کی ٹکڑی ہے اس کی تائید کے طور پر انھوں نے عبداللہ بن عمر کا اثر نقل کیا ہے۔ مذکورہ حدیث کی تقویت منذری، زیلعی اور عسقلانی کے پائے کے حفاظ حدیث نے کی ہے۔ امام شوکانی بھی اس کی تقویت کرتے ہیں۔ یہ حدیث اس مسئلے میں بہت اہم ہے۔ کم وبیش سب مفسرین کرام نے اسے ''الا ما ظھر منھا' کی تفسیر کے ضمن میں پیش کیا ہے۔

فقہا کا نقطۂ نظر

ابن رشد اندلسی اپنی کتاب 'بدایۃ المجتھد' میں کہتے ہیں کہ اکثر علما کا مذہب ہے کہ ''چہرے اور ہاتھوں کا ستر واجب

---

۱۹ ۴:۱۸۳۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

نہیں، لیکن امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے کہ پاؤں کا ستر بھی واجب نہیں[۲۰]۔ امام احمد بن حنبل کے دو اقوال ہیں: ایک قول کے مطابق وہ سارے بدن کا ستر بلا استثنا واجب سمجھتے ہیں، جبکہ دوسرے قول کے مطابق وہ جمہور فقہا کی تائید کرتے ہیں۔ ابن قدامہ المغنی میں کہتے ہیں کہ امام احمد کا دوسرا قول مشہور ہے، کیونکہ خرید و فروخت کے لیے عورت کو چہرہ ننگا رکھنے کی ضرورت ہے اور لین دین کے لیے ہاتھوں کو کھلا رکھنا پڑتا ہے۔ ایک اور حنبلی عالم ابن مفلح اپنی کتاب الآداب الشرعیۃ میں اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ سڑک پر چلتے ہوئے اجنبی عورتوں کے لیے چہرہ کھلا رکھنا جائز ہے یا نہیں؟ فرماتے ہیں کہ اس سوال کا جواب اس مسئلہ پر موقوف ہے کہ آیا عورت کے لیے چہرہ ڈھانپنا واجب ہے یا اسے دیکھ کر نگاہیں نیچی کر لینا واجب ہے[۲۱]۔ پھر وہ قاضی عیاض کا حوالہ دیتے ہیں جنھوں نے جریر سے مروی مسلم کی روایت کو نقل کیا ہے۔ حضرت جریر فرماتے ہیں: ''میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اچانک نگاہ کے بارے میں پوچھا تو آپ نے مجھے حکم دیا کہ اپنی نگاہ پھیر لو قاضی عیاض کا قول ہے کہ علما اس حدیث سے یہ دلیل لیتے ہیں کہ عورت پر اپنا چہرہ چھپانا واجب نہیں، بلکہ مرد پر واجب ہے کہ اپنی نگاہیں نیچی کر لے۔ یہ حنبلی فقہا کی رائے ہے۔ ائمہ اربعہ کے علاوہ امام اوزاعی اور امام ابن حزم کا بھی یہی قول ہے[۲۲]۔ دور جدید کے مشہور مصری فقیہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی اور شیخ محمد الغزالی کی بھی یہی رائے ہے[۲۳]۔

امام جعفر صادق سے پوچھا گیا کہ نامحرم ہونے کی صورت میں مرد عورت کے کس حصہ کو دیکھ سکتا ہے تو آپ نے فرمایا: چہرہ ہتھیلیاں اور دونوں پیر[۲۴]۔ آج بھی ایران میں جب خواتین مظاہرہ کرتی ہیں تو ان کا چہرہ کھلا ہوتا ہے۔ اس بارے میں شیعہ اور سنی علما متفق ہیں بہت کم ایسے مسائل ہیں جن میں شیعہ اور سنی علما میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

متاخرین حنفی فقہا اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ عورت کے لیے چہرہ چھپانا واجب نہیں، مگر یہ بھی کہتے ہیں کہ فتنے کے ڈر سے چہرہ چھپانا چاہیے۔ فتنے کی یہ شرط صفات الٰہیہ میں سے صفت علم کا ایک طرح کا استدراک ہے گویا کہ اللہ کے علم میں نہ تھا کہ فتنہ پیدا ہوگا۔ حالانکہ جب اللہ نے مردوں اور عورتوں کو نگاہیں نیچی کرنے کا حکم دیا تو پیش نظر فتنے کا

۲۰؎ ۱:۸۳۔

۲۱؎ ۱:۱۸۷۔

۲۲؎ المحلی ۳:۲۲۲۔

۲۳؎ الحلال والحرام ۱۵۲۔ الغزو الثقافی ۶۰،۲۷۔

۲۴؎ الکافی ۵:۵۲۱۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

سد باب تھا، لیکن اس کے باوجود چہرہ ڈھانپنے کا حکم نہ دیا۔ سورۂ حجرات کی پہلی آیت میں حکم ہے کہ اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھو۔ مطلب یہ ہے کہ دین داری کو اس حد تک نہ لے جاؤ جس کا اللہ اور اس کے رسول نے حکم نہ دیا ہو۔ یہ دین میں مبالغہ ہے، جس سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔

اس کے علاوہ فتنہ کی شرط کتمان حق کے برابر ہے، جس سے سورۂ بقرہ کی آیت ۱۵۹ میں سختی سے منع کیا گیا ہے۔ قرآن حکیم نے بہت کم موضوعات میں اتنا سخت اسلوب اختیار کیا ہے۔ جس بات کا اللہ اور اس کے رسول نے حکم دیا ہے، اسے فتنے کے خوف سے چھپانا کتمان حق ہے اور انسانیت کے حق میں ایک بہت بڑا ظلم۔ مفسرین، محدثین اور فقہاء کی تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ کتاب وسنت کی رو سے عورت کے لیے چہرہ چھپانا واجب نہیں، بلکہ اگر اسے واجب سمجھا جائے تو پردے کے سارے احکام بے معنی ہو جاتے ہیں۔ چہرے کا چھپانا نہ عادتاً واجب ہے اور نہ عباداتاً۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

خورشید ندیم

دہشت گردی اور مسلمان

۹/۱۱ کے بعد ''مسلمان اور دہشت گردی'' کے عنوان سے جس بحث کا آغاز ہوا تھا، اس میں تدریجاً تیزی آئی ہے۔ ہر نیا واقعہ اس کے لیے مہمیز ثابت ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لندن کے دھماکوں کے بعد، ہر طرف یہ عنوان زیر بحث موضوعات میں سرفہرست ہے۔ اس موضوع کے حوالے سے مسلمانوں میں تین نقطہ ہاے نظر پائے جاتے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ایک رائے یہ ہے کہ ۹/۱۱ اور اس نوعیت کے دیگر واقعات یہودی سازش کا نتیجہ ہیں۔ دنیا میں ''القاعدہ'' نام کی کوئی تنظیم موجود نہیں۔ یہ امریکہ کا ایک خود ساختہ تصور ہے جس کو استعمال کر کے مسلمانوں کے وسائل پر قبضے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

یہ رائے اتنی مضحکہ خیز ہے کہ اس کے رد میں دلائل دینا محض وقت کا ضیاع ہے۔ جنھوں نے یہ تنظیم بنائی، وہ گم نام لوگ نہیں ہیں۔ انھوں نے اپنے مقاصد اور حکمت عملی کو بھی کبھی چھپا کر نہیں رکھا۔ وہ ان تمام واقعات کی ذمہ داری بھی قبول کر چکے ہیں۔ جو لوگ یہ نقطۂ نظر رکھتے ہیں، ان کے اپنے جلسوں میں لوگ ان لوگوں کے پوسٹر اٹھائے ہوتے ہیں۔ اس لیے اس سارے معاملے کو یہودی سازش اور فرضی معاملہ سمجھنا مضحکہ خیز بات ہے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ ان واقعات کو ان مظالم سے الگ کر کے نہیں سمجھا جا سکتا جو فلسطین، افغانستان یا عراق میں روا رکھے گئے ہیں۔ چونکہ یہ معاملہ رد عمل کا ہے، اس لیے اسے عمل کے تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔ ان دلائل کا صغریٰ کبریٰ اس طرح ترتیب دیا جاتا ہے کہ اس کا حاصل ان دھماکوں اور واقعات کی تائید ہوتا ہے۔ اس میں

''دوسروں'' اور ''اپنوں'' میں ایک تمیز روا رکھی جاتی ہے۔ یعنی امریکہ، نیروبی یا لندن وغیرہ میں جو لوگ دھماکوں کی زد میں آئے، وہ ''دوسرے'' تھے اور جو افغانستان اور فلسطین وغیرہ میں دہشت گردی کا شکار ہوئے، وہ ''اپنے'' تھے۔ معروف اسکالر سعید رمضان اس کے لیے 'Contextual Justification' کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم ان دھماکوں کی تائید نہیں کرتے، لیکن یہ ایک خاص تناظر میں قابل فہم ہیں۔ آج مسلمانوں کی اکثریت اسی موقف کی قائل ہے۔

اس معاملے کے دینی پہلو سے صرف نظر کرتے ہوئے، صرف اس حوالے سے اس رائے کا جائزہ لیا جائے کہ کیا یہ حکمت عملی مسلمانوں کے مفاد میں رہی ہے تو اس کا جواب نفی میں ہے۔ افغانستان میں امریکہ کے خلاف ان کارروائیوں کو منظم کرنے کے لیے اس نقطۂ نظر کے علم برداروں نے ایک مرکز بنایا۔ یہ قدم اٹھاتے وقت انھوں نے اس پہلو سے معاملے کا جائزہ نہیں لیا کہ جس قوت کے خلاف وہ ایک جنگ کا آغاز کرنے والے ہیں، وہ مادی اعتبار سے کہاں کھڑی ہے اور یہ کہ ایسا مرکز وہ کسی صورت میں گوارا نہیں کرے گی۔ دوسری بات جس پر غور نہیں کیا گیا، وہ یہ ہے کہ اگر وہ قوت کوئی جوابی قدم اٹھاتی ہے تو کیا ہمارے پاس اپنے دفاع کا کوئی موثر نظام موجود ہے۔ بعد میں جو افسوس ناک واقعات ہوئے، انھوں نے اس بات کی تصدیق کی کہ اس حکمت عملی کو اپناتے وقت اس کے نتائج و عواقب سے پوری طرح صرف نظر کیا گیا۔ اس کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے۔ ہم نہ صرف اپنی آزادی کا دفاع نہیں کر سکے، بلکہ ہمارے لیے امکانات کی دنیا سمٹتی چلی گئی۔ اگر ایک فلسطینی بچے کی بے گناہ شہادت کا ہمیں دکھ ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہم یہ سوچیں کہ کل ہمارا کوئی دوسرا بچہ اس ظلم کا شکار نہ ہو۔ آج ایک خود کش حملے میں تین اسرائیلی مرتے ہیں تو اگلے دن کئی بے گناہ فلسطینی، جن میں عورتیں اور بچے شامل ہیں، ایک نئے ظلم کا شکار ہوتے ہیں۔ چند سال پہلے جو تناسب تھا، اس کے مطابق ایک اسرائیلی کے مقابلے میں پانچ فلسطینی مار دیے جاتے تھے۔ آج اس تناسب میں مزید اضافہ ہو چکا ہے۔

اہل نفسیات کا کہنا ہے کہ ردعمل میں سوچنے والا دماغ کبھی درست فیصلہ نہیں کرتا۔ 'Contextual Justification' کا تصور دراصل ردعمل پر مبنی ہے، اس لیے اس کے نتیجے میں مسلمانوں کے دکھوں میں اضافہ ہوا ہے۔

اس نقطۂ نظر کی ایک اور خامی یہ ہے کہ اس میں اپنوں اور دوسروں کی جو تقسیم کی گئی ہے، وہ غیر حقیقی ہے۔ نیو یارک اور لندن وغیرہ میں جو لوگ دہشت گردی کا شکار ہوئے، اس میں بہت سے ہمارے اپنے بھائی بھی تھے۔ ایک

کثیرالمدنی (Pluristic) سوسائٹی میں کوئی حادثہ ہوتا ہے تو اس کا نشانہ تمام مذاہب اور قومیتوں کے لوگ بنتے ہیں۔

تیسری رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس عسکری حکمت عملی سے جس کے مظاہر میں دھماکے اور خودکش حملے شامل ہیں، پوری طرح دست بردار ہو جانا چاہیے۔ اگر کوئی ظلم ہوتا ہے تو اس پر صبر کرنا چاہیے اور تمام توجہ اپنی تعمیر پر دینی چاہیے۔ قوموں کی تعمیر کا دنیا میں ہمیشہ ایک ہی مطلب رہا ہے کہ وہ تعلیم، معیشت اور سماجی تنظیم میں آگے بڑھے۔ فطرت کا قانون یہ ہے کہ مثبت سوچ کے ساتھ آگے بڑھنے والے کا راستہ روکنا ممکن نہیں ہوتا۔ توانائی (Energy) کے بارے میں فزکس کا مسلمہ کلیہ (Law) ہے کہ اس کی صورت تبدیل ہو سکتی ہے، لیکن اسے فنا نہیں کیا جا سکتا۔ آج ضرورت ہے کہ ہم اپنی توانائی کا رخ موڑ دیں اور صبر کے ساتھ اپنی تعمیر پر لگ جائیں۔ جنگ عظیم دوم کے بعد جاپان نے ہزیمت اٹھائی اور یہ پابندی قبول کی کہ وہ کوئی فوج نہیں رکھے گا۔ جاپانی قوم نے اپنی توانائی کو مجتمع کیا اور اسے ایک دوسرا رخ دیا جس کے نتیجے میں اس کی معاشی قوت میں اضافہ ہوا۔ آج وہ عالمی اقتصادیات کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور کوئی اہم فیصلہ اس کی شرکت کے بغیر نہیں ہوتا۔ وہ اب اپنی سیاسی حیثیت میں بھی اضافہ کر رہا ہے اور اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی رکنیت کا امیدوار ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ہم آج دنیا سے جو مطالبات کرتے ہیں، وہ اس غلط فہمی پر مبنی ہیں کہ عالمی سطح پر معاملات حق و انصاف کی بنیاد پر طے ہوتے ہیں۔ پیغمبروں اور خلفاے راشدین کے دور کے علاوہ دنیا کی معلوم تاریخ میں ایسا لمحہ کم ہی آیا ہے جب فیصلے انصاف کی بنیاد پر ہوئے ہوں۔ دنیا کے فیصلے ہمیشہ انھوں نے کیے جن کے ہاتھ میں طاقت رہی ہے۔ یہ بات محلے سے لے کر عالمی سطح تک ہمیشہ ثابت رہی ہے۔ ابن خلدون سے لے کر ٹوئن بی اور پال کینیڈی تک، جنھوں نے تہذیبوں اور عالمی قوتوں کے عروج و زوال کا مطالعہ کیا ہے اور فلسفۂ تاریخ میں اقوام کے عروج و زوال کے جو معیارات بتائے گئے ہیں، وہ سب اس پر مہر تصدیق ثبت کر رہے ہیں۔ میں اس میں ایک اضافی بات یہ کہنا چاہتا ہوں کہ غلبے کے لیے مادی قوت کے ساتھ ساتھ اخلاقی قوت بھی ضروری ہے۔ جب کوئی غالب قوم اخلاقی طور پر تباہ ہو جاتی ہے تو پھر وہ غالب نہیں رہتی۔ چرچل کا یہ مشہور جملہ بھی اس کی تائید کرتا ہے کہ اگر برطانیہ کی عدالتوں میں انصاف ہو رہا ہے تو پھر برطانیہ کو کوئی خطرہ نہیں۔ اخلاقیات کا یہ مظاہرہ داخلی معاملات میں ہونا چاہیے اور بین الاقوامی معاملات میں بھی۔ جہاں تک بین الاقوامی معاملات کا تعلق ہے، میرا تاثر یہ ہے کہ عراق پر حملے کے بعد امریکہ اخلاقی تباہی کے راستے پر ہے اور اگر اس کے ہاں اخلاقی معیارات کے زوال کا یہی عالم رہا تو اس کا سیاسی زوال یقینی

ہے۔تاہم عروج کی طرح زوال بھی ایک تدریجی عمل ہے اور اقوام کے معاملے میں یہ سالوں پر محیط ہوتا ہے۔

میں اس تیسری رائے کو درست سمجھتا ہوں۔ مجھے افغانی، فلسطینی اور کشمیری مسلمان بھائیوں، بہنوں اور بچوں کے مرنے پر دکھ ہوتا ہے۔اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ہمارا کوئی بھائی یا بچہ مزید اس ظلم کا شکار نہ ہو۔اس کے لیے ضروری ہے کہ تصادم اور ردعمل کی نفسیات سے نکل کر ہم وقتی طور پر اس عدم توازن کو قبول کر لیں جو آج واقع ہو چکا ہے۔اس قبولیت کے بعد ہی تعمیر کا عمل شروع ہوگا۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

محمد وسیم اختر مفتی

’’قاسم بن محمد‘‘ ـــــــ ایک تنقید کا جائزہ

ماہنامہ ’’اشراق‘‘ کے جون ۲۰۰۵ کے شمارے میں مشہور تابعی فقیہ قاسم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کے بارے میں ہمارا ایک مضمون چھپا تھا۔ اس میں ہم نے لکھا تھا:

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

’’دوسرے خلیفۂ راشد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ایران کے جنگی قیدی مدینہ لائے گئے، آخری ایرانی بادشاہ یزدگرد کی تین بیٹیاں بھی ان میں شامل تھیں۔ اس زمانے کے جنگی قانون کے مطابق قیدیوں کی فروخت ہوئی تو حضرت عمر نے ان تینوں کو بھی بیچنے کا حکم دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا: شاہ زادیوں سے عام عورتوں والا سلوک نہ کیا جائے۔ خلیفۂ ثانی نے سوال کیا: تو ان کے ساتھ کیسا سلوک کیا جائے؟ حضرت علی کا جواب تھا، ان کی قیمت لگوائی جائے اور جو قیمت بھی ہو دے کر وہ شخص ان کا نگران بن جائے جو انھیں پسند کر لے۔ چنانچہ ان کی قیمت لگی اور خود حضرت علی نے ان کی ذمہ داری اٹھا لی۔ اپنی تحویل میں آنے کے بعد انھوں نے ایک شہزادی عبداللہ بن عمر کو ہبہ کر دی، دوسری اپنے بیٹے حضرت حسین کو دی اور تیسری کو اپنے پاس پرورش پانے والے محمد بن ابوبکر صدیق کی ملکیت میں کر دیا۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ تینوں کے ہاں پیدا ہونے والے بیٹے نامور اور نمایاں حیثیت کے حامل ہوئے۔ عبداللہ بن عمر کے ہاں سالم نے جنم لیا، حضرت حسین کے بیٹے علی امام زین العابدین کے نام سے مشہور ہوئے اور محمد بن ابوبکر صدیق کے ہاں قاسم کی پیدایش ہوئی۔ یہ تینوں نامور تابعی جو خالہ زاد بھائی تھے اور جن کی مائیں یزدگرد کی بیٹیاں تھیں فہم دین اور تقویٰ میں مثال سمجھے جاتے ہیں۔‘‘ (۶۴)

اس عبارت کے بارے میں ہمارے بعض احباب نے اعتراض اٹھایا ہے کہ یزدگرد ۱۶ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا اور فتح ایران کے وقت اس کی عمر ۱۸ سال تھی۔ اس کی بیٹیاں اگر تھیں بھی تو اتنی عمر کی نہیں ہو سکتیں کہ جنگی قیدیوں

میں ان کی تقسیم عمل میں آ جاتی۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ مستند بات ہی لکھی جائے، تقریر میں لغزش زباں کا بہت خدشہ ہوتا ہے جب کہ تحریر میں اپنی غلطی دور کرنے کے لیے وقت میسر آ جاتا ہے۔ بعض اوقات متضاد روایتوں یا مختلف فیہ مسائل میں ترجیح قائم کرتے ہوئے غلطی ہو جاتی ہے یا اعتراض کا محل پیدا ہو جاتا ہے، تب درست تحقیق ہی کشادگی کی راہیں وا کرتی ہے۔

پہلے ہم ان تاریخی مآخذ کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جن سے ہم نے اپنا مضمون ترتیب دیا۔ مسئلۂ معترض علیہ میں اصل مدار زمخشری کی کتاب ''ربیع الابرار'' پر ہے۔ یہ اخلاقیات کی کتاب ہے، ضمناً اس میں تاریخ، آثار اور روایات کا ذکر بھی آ جاتا ہے۔ ہم نے اس روایت کو اس لیے بیان کیا ہے کہ اس کا راوی ثقہ ہے اور اسے ابن خلکان، ابن کثیر اور ذہبی جیسے بڑے مورخین نے قبول کیا ہے۔ 'باب العبید و الاماء و الخدم و الأمر بالاستیصاء بالممالیك خیراً و النهی عن سوء الملكة و نحو ذلك' (باب غلاموں، باندیوں، خادموں کے بارے میں، مملوکوں سے اچھے سلوک کے حکم کا معاملہ، بری ملکیت سے روکنا اور اس جیسی دوسری باتیں) میں زمخشری کی اصل عبارت یوں ہے:

ابو الیقضان: ان قریشالم تكن ترغب فی امهات الاولاد حتی ولدن ثلاثا هم خیر أهل زمانهم: علی بن الحسین والقاسم بن محمد و سالم بن عبداللّٰه ۔ وذلك ان عمر رضی اللّٰه عنه أتی بنات یزدجرد بن شهریار بن كسری سبیات، فأراد بیعهن، فقال له علی: ان بنات الملوك لایبعن، ولكن قوموهن، فأعطاه أثمانهن، فقسمهن بین الحسین بن علی و محمدبن أبی بكر الصدیق و عبد اللّٰه بن عمر، فولدن الثلاثة.

(ربیع الابرار و نصوص الاخبار، دار الذخائر ۳/ ۵۴۵)

''ابو یقضان کی روایت: قریش باندیوں سے اولاد پیدا کرنا پسند نہ کرتے تھے حتیٰ کہ (ان میں یہ رغبت پیدا ہوئی جب) ان باندیوں نے تین ایسے بچوں کو جنم دیا جو اپنے وقت کے بہترین لوگ ثابت ہوئے: علی بن حسین، قاسم بن محمد اور سالم بن عبداللہ۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس یزدگرد بن شہر یار بن کسریٰ (خسرو پرویز) کی بیٹیاں قیدی بنا کر لائی گئیں۔ انھوں نے ان کو فروخت کرنا چاہا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: شاہ زادیوں کو بیچا نہیں جاتا، اس کی بجائے ان کی قیمت طے کر لیں۔ پھر انھوں نے ان کی مقررہ قیمت ادا کی اور شاہ زادیاں حسین بن علی، محمد بن ابو بکر اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنھم کے حوالے کر دیں تب ان سے یہ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

تینوں (علی بن حسین، قاسم بن محمد اور سالم بن عبداللہ)

پیدا ہوئے۔''

زمخشری نے یہ بات ابو یقصان کے حوالے سے نقل کی ہے۔ ابن ندیم نے ابو یقظان نسابۃ کے عنوان سے لکھا ہے:

''سحیم لقب اور نام عامر بن حفص تھا۔ واقعات، حسب و نسب، آثار اور عیوب کے عالم تھے، اپنی روایت میں ثقہ تھے۔'' (الفہرست، دارالمعرفہ، بیروت ۱۳۸)

ابن خلکان نے الفاظ کی کچھ تبدیلی کے ساتھ اسی روایت کو زمخشری ہی کے حوالے سے نقل کیا ہے:

''زین العابدین کی والدہ کا نام سلافہ بنت یزدگرد تھا۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں ایران کے جنگی قیدی مدینہ لائے گئے، ان میں یزدگرد کی تین بیٹیاں بھی تھیں۔ انھوں نے قیدیوں کو فروخت کے لیے پیش کیا اور حضرت عمر نے یزدگرد کی بیٹیوں کو بھی بیچنے کا حکم دیا۔ علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ شاہ زادیوں سے عام عورتوں والا سلوک نہ کیا جائے۔ حضرت عمر نے سوال کیا: تو ان کے ساتھ کیسے معاملہ کیا جائے؟ علی رضی اللہ عنہ کا جواب تھا: ان کی قیمت لگوائی جائے اور جو قیمت بھی ہو دے کر وہ شخص ان کا نگران بن جائے جو انھیں پسند کر لے۔ چنانچہ ان کی قیمت لگی اور انھیں حضرت علی نے خرید لیا۔ پھر انھوں نے ایک عبداللہ بن عمر کو دے دی، دوسری اپنے بیٹے حسین رضی اللہ عنہ کو دی اور تیسری کو اپنے پاس پرورش پانے والے محمد بن ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ملکیت میں کر دیا۔ عبداللہ کی باندی سے سالم پیدا ہوئے، حسین کے ہاں زین العابدین اور محمد کے گھر قاسم کی پیدائش ہوئی۔ یہ تینوں خالہ زاد بھائی، ان کی مائیں یزدگرد کی بیٹیاں تھیں۔'' (وفیات الاعیان ۳/ ۲۶۷)

یہ روایت یزدگرد کی تفصیل کے بغیر ان تینوں تابعین کے تذکرے میں مزی نے بھی نقل کی ہے:

''مدینہ کے باشندے لونڈیوں کو امہات اولاد بنانا پسند نہ کرتے، یہاں تک کہ ان میں روشن رو، عالی مرتبت علما علی بن حسین، قاسم بن محمد اور سالم بن عبداللہ پیدا ہوئے اور علم و تقویٰ میں مدینہ والوں پر چھا گئے تب لوگوں نے اولاد کی خاطر باندیوں میں دل چسپی لی۔'' (تہذیب الکمال فی اسماء الرجال ۱۰/ ۱۵۰)

حافظ ذہبی کہتے ہیں:

''ابو زناد کی روایت ہے کہ اہل کوفہ لونڈیوں سے اولاد پیدا کرنا اچھا نہ سمجھتے تھے حتیٰ کہ ان میں علی بن حسین، قاسم اور سالم فقہا کی حیثیت میں پروان چڑھے اور علم، پرہیز گاری اور عبادت میں مدینہ والوں سے سبقت لے گئے تب انھوں نے اولاد کی خاطر باندیوں میں دل چسپی لی۔'' (تاریخ الاسلام، حوادث و وفیات ۱۰۱۔۱۲۰ھ، ۹۰)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

محمد بن سعد علی بن حسین زین العابدین کے حالات بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

''ان کی والدہ ام ولد تھیں، غزالہ ان کا نام تھا۔ حضرت حسین کی شہادت کے بعد وہ ان کے آزاد کردہ غلام زیید (ابن قتیبہ نے زبید لکھا ہے) کی زوجیت میں آئیں، ان سے عبداللہ بن زیید پیدا ہوئے تو وہ علی بن حسین کے ماں جائے بھائی ہوئے۔'' (طبقات ابن سعد ۵/۲۱۸)

مزی تحریر کرتے ہیں:

''ان کی والدہ باندی تھیں، ان کا نام سلاّمہ یا غزالہ تھا۔'' (تہذیب الکمال فی اسماء الرجال ۲۰/۳۸۲)

ابن کثیر علی بن حسین کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان کی ماں ام ولد تھیں، سلافہ ان کا نام تھا۔'' (البدایۃ والنہایۃ، دار الفکر، بیروت ۱۹۹۶ء، ۶/۲۲۹)

پھر انھوں نے ابن خلکان اور زمخشری کے حوالے سے اسی روایت کا تذکرہ کیا۔ ابن قتیبہ کہتے ہیں:

''زین العابدین کی والدہ سندھ کی تھیں، ان کا نام سلافہ یا غزالہ تھا۔''

(المعارف، المکتبۃ الحسینیہ، مصر، ۱۹۳۴ء، ۱۱۰)

یعقوب بن اسحاق کلینی کا کہنا ہے:

''علی بن حسین رضی اللہ عنہ کی والدہ کا نام سلامہ بنت یزدگرد بن شہریار بن شیرویہ بن کسریٰ پرویز تھا... حضرت علی نے مشورہ دیا: اسے مسلمانوں میں سے کوئی آدمی خود چن لینے دیجیے... چنانچہ اس نے اپنا ہاتھ حضرت حسین کے سر پر رکھ دیا۔ حضرت علی نے پوچھا: تمھارا نام کیا ہے؟ اس نے جواب دیا: جہاں شاہ۔ آپ نے کہا: نہیں، بلکہ شہربانو۔'' (الاصول من الکافی ۱/۴۶۷)

کلینی نے ان دونوں سے علی بن حسین کے تولد ہونے کے بارے میں ابو اسود دؤلی کا شعر بھی نقل کیا ہے:

وان غلاماً بین کسریٰ وھاشم لأکرم من نیطت علیہ النمائم

''خسرو کی اولاد اور ہاشم کی اولاد کے ملاپ سے پیدا ہونے والا بچہ (علی بن حسین) تعویذ لٹکائے ہوؤں (بچوں) میں سب سے بڑھ کر عزت کا حامل ہے۔''

ذہبی کہتے ہیں:

''زین العابدین کی والدہ باندی تھیں۔ ان کا نام سلافہ بنت یزدگرد تھا جو ایران کا آخری بادشاہ تھا۔''

(تاریخ الاسلام، حوادث و وفیات ۸۱۔۱۰۰ھ، ۴۳۹)

''اردو دائرۂ معارف اسلامیہ'' میں ہے:

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

''یزدگرد کی ایک شہزادی شہربانو نے خلیفۂ چہارم حضرت علی کے صاحب زادے حضرت حسین سے شادی کر لی۔'' (۱۰/ ۶۰۳)

قاسم بن محمد کے بارے میں ابن سعد نے لکھا ہے:

''ان کی والدہ ام ولد تھیں، سودہ ان کا نام تھا۔'' (طبقات: ۳/ ۳۹۹)

یہی عبارت مزی نے ابن سعد ہی کے حوالے سے نقل کی۔ ابن سعد سالم بن عبداللہ بن عمر کی بابت لکھتے ہیں:

''ان کی والدہ ام ولد تھیں۔'' (طبقات ۳/ ۴۰۶)

مزی کہتے ہیں:

''ان کی والدہ ام سالم ام ولد تھیں۔'' (تہذیب الکمال فی اسماء الرجال ۱۰/ ۱۴۵)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نوشیرواں کا پوتا خسرو پرویز تخت نشین تھا۔ اس کے مرنے کے بعد آپ کی پیشین گوئی کے مطابق ایرانی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔ پہلے اس کا بیٹا شیرویہ تخت پر بیٹھا، اس نے سب بھائیوں کو قتل کرادیا، لیکن صرف ۸ ماہ حکومت کر سکا۔ پھر اس کے نوعمر بیٹے شہر یار نے راج گدی سنبھالی، اسے ایک درباری نے قتل کر دیا۔ شاہی خاندان میں ایک چھوٹے بچے یزدگرد کے سوا کوئی نہ بچا تو ایک عورت بوران دخت کو یہ سنگھاسن اس شرط پر سونپ دیا گیا کہ خاندان کا مرد بالغ ہونے پر اس کا حق اس کو دے دیا جائے گا۔ (تاریخ اسلام: شاہ معین الدین ندوی) مسلمانوں کے ساتھ ایرانیوں کی کشمکش خسرو پرویز کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط پھاڑنے کے بعد ہی شروع ہو گئی تھی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں منکرین زکوٰۃ کی سرکوبی کے بعد حیرہ فتح ہوا تھا کہ ان کی وفات ہو گئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلافت ملی، آپ کا زمانۂ خلافت ۱۳ھ (۶۳۴ء) سے شروع ہو کر ۲۳ھ (۶۴۴ء) میں آپ کی شہادت تک ۱۱ سالوں تک محیط رہا۔ اس تمام عرصے میں اور خلیفۂ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اکثر دور حکومت میں ایرانی مسلمانوں سے برسر پیکار رہے۔ جسر کی فتح کے بعد ایرانیوں کو جنگ بویب (۱۳ھ) میں شکست ہوئی، انھیں سعد بن ابو وقاص کے لشکر کی آمد کی خبر ملی تو ان کے اعیان سلطنت اکٹھے ہوئے۔ انھوں نے دو بڑے کمانڈروں رستم اور فیرزان کو بلایا اور ان کو متنبہ کیا کہ اگر تم نے صحیح طریقے سے جنگ نہ کی تو ہم تم دونوں کو قتل کر کے اپنا غصہ ٹھنڈا کریں گے۔ پھر انھوں نے فیصلہ کیا کہ خسرو کی بیویوں کو ڈھونڈیں، ان میں جس کے پاس بھی خسرو کی نر اولاد ہوئی، اسے ایرانیوں کا بادشاہ بنا دیں۔ اس طرح وہ یزدگرد کی والدہ تک پہنچے، یزدگرد بن شہر یار بن کسریٰ (خسرو) بادشاہ بنا تو اس کی عمر ۲۱ سال تھی۔ یہ ۱۳ھ کا واقعہ ہے، اسے بادشاہ بنا کر ایرانی

www.javedahmadghamidi.com

خوش تھے۔[1] ۱۴ھ میں قادسیہ کی جنگ ہوئی، ۱۶ھ میں سعد بن ابو وقاص نے ایران کے دار الخلافہ مدائن پر قبضہ کیا تو یزدگرد حلوان منتقل ہو گیا۔ مسلمان حلوان کا محاصرہ کرنے پہنچے۔ ۱۹ھ میں جلولا کی جنگ ہوئی تو وہ مہران جا پہنچا۔ وہاں سے رے آیا۔ رے کا محاصرہ ہوا تو وہ اصفہان پہنچ گیا۔ ۲۱ھ میں معرکۂ نہاوند ہوا جس نے ایرانیوں کی کمر توڑ دی۔ اصفہان مفتوح ہونے کے بعد یزدگرد کرمان جا پہنچا۔ مسلمانوں نے کرمان کو فتح کر لیا تو اس نے خراسان میں ڈیرہ جما لیا، وہ آگ جس کی یہ پرستش کرتا تھا اس کے ساتھ شہر شہر گردش کرتی رہی۔[2] اسی دوران میں جب وہ کچھ افراد خانہ کے ساتھ کرمان سے مرو جا رہا تھا کہ ترکوں نے حملہ کر کے اس کے ساتھیوں کو مار ڈالا۔ اس نے بھاگ کر ایک چکی والے کے ہاں پناہ لی۔ یہاں اسے پہچان لیا گیا اور خود چکی کے مالک نے یا فوجیوں نے اسے مار ڈالا۔[3] یہ واقعہ ۳۱ھ میں پیش آیا، اس طرح یزدگرد کی عمر ۴۰ سال بنتی ہے۔ اس نے قریباً ۲۰ سال حکومت کی، اسے صرف پہلے ۴ سال اطمینان کا سانس لینا نصیب ہوا، بقیہ سال مسلمانوں کے خوف سے ایک شہر سے دوسرے شہر تک بھاگتا رہا۔ وہ اس روئے زمین پر آخری ساسانی بادشاہ ہوا۔ اس خاندان کا ۴۱۶ سالہ دور اس پر ختم ہو گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان سچا ثابت ہوا: 'ذا هلك كسرى فلا كسرى بعده واذا هلك قيصر فلا قيصر بعده'[4]، (جب کسریٰ (خسرو) مرے گا تو بعد ازاں کوئی کسریٰ (خسرو) نہ آئے گا اور جب قیصر کی موت ہو گی تو اس کے بعد کوئی قیصر پیدا نہ ہو گا۔[5])

ابن قتیبہ نے ''المعارف'' میں ''ملوک العجم'' کے عنوان سے حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد سے لے کر یزدگرد تک، تمام ایرانی بادشاہوں کی فہرست تحریر کی ہے۔ خسرو پرویز کے بعد تخت نشین ہونے والے بادشاہوں کی ترتیب انھوں نے اس طرح بیان کی: شیرویہ بن پرویز، اردشیر بن شیرویہ، خوہان، کسریٰ بن قباذ، بوران بنت خسرو، خسرو کا چچازاد (نام نہیں لکھا)، ارزمیدخت بنت خسرو اور یزدگرد۔ یزدگرد کے بارے میں کہتے ہیں:

---

[1] تاریخ الامم والملوک، طبری، دار الفکر بیروت، ۱۹۷۹ء، ۸۱/۴۔ البدایۃ والنہایۃ، ابن کثیر، دار الفکر بیروت، ۱۹۹۶ء، ۵/۷، ۹۸۔ الکامل فی التاریخ، ابن اثیر، دار صادر، بیروت، ۱۹۶۵ء، ۴۴۸/۲۔

[2] تاریخ الامم والملوک ۴/ ۲۶۳۔ البدایۃ والنہایۃ ۵/ ۲۰۵۔

[3] تاریخ الامم والملوک ۵/ ۱۷۔ البدایۃ والنہایۃ ۵/ ۲۴۰۔ فتوح البلدان، بلاذری، دار الکتب العلمیہ، بیروت ۳۱۲۔ الکامل فی التاریخ، ابن اثیر ۱۱۹/۳۔ ۱۲۳۔

[4] بخاری، رقم ۳۱۲۱۔

[5] البدایۃ والنہایۃ ۵/ ۲۴۲۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

''ایرانیوں نے اسے بادشاہ بنایا تب وہ ۱۵ سال کا تھا۔اس نے پایۂ تخت مدائن میں ۸ سال انتشار میں گزارے اور پورے ۲۰ سال حکومت کی۔'' (المعارف: ۲۹۳۔۲۹۴)

''تاریخ اسلام'' کے مصنف شاہ معین الدین ندوی نے تخت نشینی کے وقت یزدگرد کی عمر ۱۷ سال بتائی ہے[6]۔ جب کہ اکبر شاہ خاں نجیب آبادی نے طبری، ابن کثیر اور ابن اثیر کے تتبع میں اس موقع پر اس کی عمر ۲۱ سال ہی لکھی ہے[7]۔

واقعات کی ترتیب سے پتا چلتا ہے کہ باندیوں کی فروخت کا واقعہ دور فاروقی کے آخر میں پیش آیا ہوگا، اس لیے کہ یزدگرد کا قتل ۴۰ سال کی عمر میں خلیفۂ ثانی کی شہادت کے ۹ سال بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں ہوا[8]۔ اس دوران میں ایرانیوں سے کئی معرکے پیش آئے، یزدگرد ایک کے بعد دوسری جگہ بھاگتا رہا۔ اس اتھل پتھل میں کسی وقت اس کی بیٹیاں مسلمانوں کی قید میں آئیں اور پھر مدینہ پہنچیں تو مذکورہ واقعہ پیش آیا۔ تاریخ وقت کا تعین کرنے سے عاجز ہے۔ ۱۳ھ میں اپنی تاج پوشی کے وقت یزدگرد کی عمر ۲۱ سال تھی تو اس واقعے کے وقت اندازاً ۳۰ سال تو رہی ہوگی۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق اس کی شادی صحیح وقت پر ہوئی ہو تو اس کی بیٹیاں اس موقعے پر ۱۲ سے ۱۵ سال کی ہوسکتی ہیں۔ اگر شاہ زادیوں کی عمر کم ہو تو بھی ان کی کم عمری ان کی تقسیم میں حائل نہیں ہوسکتی کیوں کہ اس زمانے میں جنگی قیدیوں (POWs) کو فاتح معاشرے میں کھپانے کا یہی طریقہ تھا۔ ان تینوں تابعین کی پیدایش کی تاریخیں بھی ان کے ایرانی شاہ زادیوں کے بطن سے پیدا ہونے کی تائید کرتی ہیں۔ قاسم بن محمد کی پیدایش کم و بیش ۱۳ سال بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ہوئی[9]۔ ذہبی ہی کا کہنا ہے کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں پیدا ہوئے[10]۔ ان کی زیادہ سے زیادہ عمر ۷۲ سال بتائی گئی ہے[11]۔ اس حساب سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں ان کی پیدایش والی روایت درست لگتی ہے۔ علی بن حسین زین العابدین سانحۂ کربلا میں اپنے والد حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔ اس وقت ان کی عمر ۲۳ سال تھی، انھیں ان کی بیماری کی وجہ سے چھوڑ دیا گیا[12]۔ یہ سانحہ ۶۱ھ میں پیش آیا، حساب لگایا جائے تو ان کی تاریخ پیدایش باندیوں والے

---

[6] تاریخ اسلام، اسلامی اکادمی، لاہور، ۱/۱۵۱۔

[7] تاریخ اسلام، اکبر شاہ خاں نجیب آبادی، نفیس اکیڈیمی، کراچی، ۱۹۸۶ء، ۱/۲۸۸۔

[8] تاریخ الامم والملوک ۵/۱۷۔

[9] سیر اعلام النبلاء، ذہبی، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۹۲ء، ۵/۵۲۔

[10] تاریخ الاسلام حوادث ووفیات ۱۰۱۔۱۲۰ھ، ۲۱۷۔

[11] الطبقات الکبریٰ، محمد بن سعد، دار الفکر، بیروت، ۱۹۹۴ء، ۳/۴۰۵۔

واقعے کے قریباً ۱۵ سال بعد ۲۷ھ یا ۲۸ھ بنتی ہے۔ حافظ ذہبی نے ۳۴ھ کا تعین کیا ہے[۱۳]۔ کلینی نے ان کی تاریخ پیدایش ۳۸ھ بتائی ہے[۱۴]۔ سالم بن عبداللہ بن عمر کے سن پیدایش کے بارے میں ہمیں کوئی رہنمائی نہیں مل سکی۔ وہ ۱۰۶ھ میں فوت ہوئے۔ اگر ان کی عمر ۷۵ سال سمجھ لی جائے جو اس زمانے کی اوسط عمر تھی تو غالباً وہ ۳۰ھ میں پیدا ہوئے ہوں گے۔

اس بحث کو سمیٹا جائے تو کچھ نتائج نکلتے ہیں۔

تمام مورخین متفق ہیں کہ ان تینوں بزرگوں کی مائیں ام ولد تھیں۔ ام ولد اس لونڈی کو کہتے ہیں جس سے آقا کی اولاد ہو۔ یہ آقا کی وفات کے بعد آزاد ہو جاتی ہے۔ زیادہ مورخین ان کی ماؤں کے تفصیلی حالات نہیں بتاتے۔ کچھ تفصیل میں گئے تو وہی روایت بیان کی ہے جو ہم نے نقل کی۔ صرف ابن قتیبہ کی روایت مختلف ہے اس کے مطابق ان میں سے صرف ایک بزرگ علی بن حسین زین العابدین کی والدہ سندھی تھیں۔

ایک طرف طبری، ابن کثیر، ابن اثیر اور ذہبی جیسے مورخین ہیں جنھوں نے امہات کتب لکھیں، یہ وہ لوگ ہیں جو سند کے بغیر بات نہیں کرتے۔ دوسری طرف اکیلے ابن قتیبہ ہیں جو اگرچہ طبری سے تقدم رکھتے ہیں (۲۷۶ھ میں فوت ہوئے جب کہ طبری کی وفات ۳۱۰ھ میں ہوئی) اور ادب و نحو کے ساتھ انھوں نے تاریخ پر بھی لکھا ہے، لیکن انھوں نے ''المعارف'' میں اپنی روایات کے مآخذ بیان نہیں کیے۔ سکہ بند اہل تاریخ کا اس روایت سے تعرض نہ کرنا اسے چھوڑنے کی دلیل بن سکتا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو ان کی مذکورہ عبارت ابن سعد (وفات: ۲۳۰ھ) کی طبقات (۴۱۸/۳) کی عبارت سے ملتی جلتی ہے، لیکن 'ان امه سندية' کے الفاظ اس میں موجود نہیں یوں ابن قتیبہ اس روایت میں تنہا رہ جاتے ہیں۔

کلینی اور شاہ معین الدین ندوی نے یزدگرد کا شجرۂ نسب یزدگرد بن شہر یار بن شیرویہ بن کسریٰ لکھا ہے جب کہ زمخشری، طبری اور ابن کثیر نے شیرویہ کے ذکر کے بغیر یزدگرد بن شہر یار بن کسریٰ تحریر کیا ہے۔ یہی قرین قیاس ہے۔ ایسا ماننے سے ابن قتیبہ اور شاہ معین الدین کی تفصیل میں خلل آ جائے گا۔

تخت نشینی کے وقت یزدگرد کی عمر ۲۱ سال ہونا درست لگتا ہے۔ ۱۵ سال والی روایت شاذ بھی ہے اور ایک نوعمر

۱۲؎ البدایہ والنہایہ ۲۳۰/۶۔

۱۳؎ تاریخ الاسلام، عہد الخلفاء الراشدین، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۹۸۷ء، ۴۲۸۔

۱۴؎ الاصول من الکافی ۴۶۶/۱۔

www.javedahmadghamidi.org www.al-mawrid.org

لڑکے کا اس طرح اسلامی افواج سے برسر پیکار رہتے ہوئے امور مملکت کا چلانا مشکل نظر آتا ہے۔شاہ معین الدین کی بتائی ہوئی ۱۷ سال کی عمر جمہور مورخین کی معروف روایت سے مطابقت رکھتی ہے نہ ابن قتیبہ کی شاذ روایت سے۔

ایسا لگتا ہے تقسیم غنائم کے وقت شہزادیاں ان نوجوانوں کے سپرد تو کر دی گئیں، لیکن انھیں ام ولد بنانے کا موقع بعد میں آیا۔

یہ ساری بحث قاسم بن محمد کے سوانح بیان کرنے کے نتیجے میں پیدا ہوئی۔ان کا جلیل القدر تابعی اور فقیہ ہونا سب مانتے ہیں۔ ہر تاریخی شخصیت کے سن پیدایش اور سن وفات میں اختلاف ضرور نقل ہوا ہے۔اسی طرح ان کی اولادوں، والدین، حتیٰ کہ ان سے متعلق اہم واقعات میں بھی کچھ نہ کچھ اختلاف رہا ہے۔ یہ اختلاف اس شخصیت کے مجموعی تاثر کو ختم نہیں کرتا جو تاریخ ہی ہم تک منتقل کرتی ہے۔قاسم بن محمد کی والدہ کے معاملے سے صرف نظر کر لیا جائے تو نفس مضمون میں ہمارا اور ہمارے معترض احباب کا کوئی اختلاف نہیں رہتا۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com